Karnataka State Open University

Manasagangothri, MYSORE

URDU OPTIONAL - FIRST-B.A.

POETRY & PROSE (SLM)

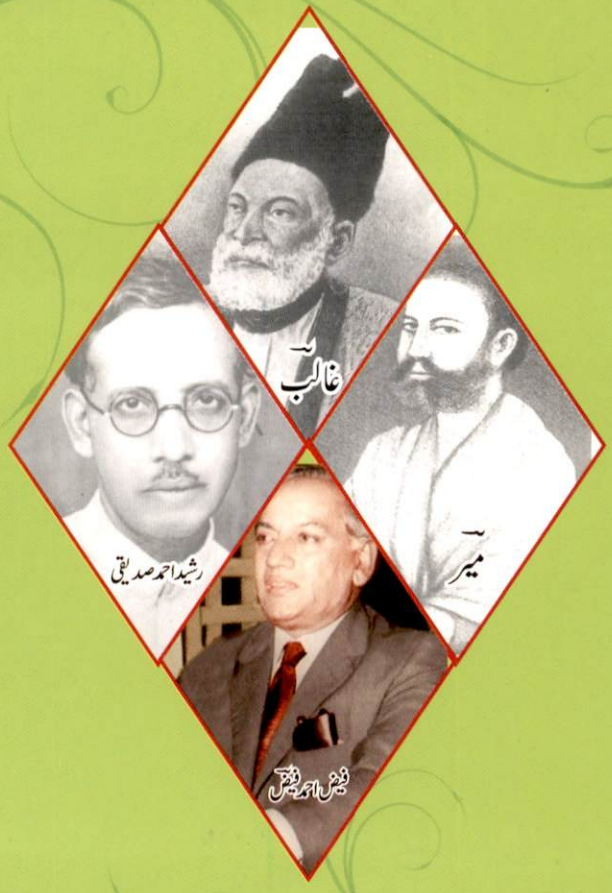

اردو ادب : اختیاری مضمون

بی اے تین سالہ ڈگری کورس

سالِ اوّل - بی اے پرچہ اوّل

نظم و نثر

Paper 1 **COURSE - 1**

BLOCK-1, 2, 3

KSOU NATIONAL INTERNATIONAL RECOGNITION

Karnataka State Open University (KSOU) was established on 1st June 1996 with the assent of H.E. Governor of Karnataka as a full fledged University in the Academic year 1996 vide Government notification No./EDI/UOV/dated 12th February 1996 (Karnataka State Open University Act – 1992). The Act was promulgated with the object to incorporate an Open University at the State Level for the introduction and promotion of Open University and Distance Education Systems in the education pattern of the State and the Country for the Co-ordination and determination of standard of such systems.

- With the virtue of KSOU Act of 1992, Karnataka State Open University is empowered to establish, maintain or recognize Institutions, Colleges, Regional Centres and Study Centres at such places in Karnataka and also open outside Karnataka at such places as it deems fit.
- All Academic Programmes offered by Karnataka State Open University are recognized by the Distance Education Council (DEC), Ministry of Human Resource Development (MHRD), New Delhi.
- Karnataka State Open University is a regular member of the Association of Indian Universities (AIU), New Delhi, since 1999.
- Karnataka State Open University is a permanent member of Association of Commonwealth Universities (ACU), London, United Kingdom since 1999. Its member code number: ZKASOPENUINI.
- Karnataka State Open University is a permanent member of Asian Association of Open Universities (AAOU), Beijing, CHINA, since 1999.
- Karnataka State Open University has association with Commonwealth of Learning (COL), Vancouver, CANADA, since 2003. COL is an intergovernmental organization created by commonwealth Heads of Government to encourage the development and sharing of open learning distance education knowledge, resources and technologies.

Higher Education To Everyone Everywhere

Karnataka State Open University

Manasagangothri, Mysore

Optional Urdu - I BA

Paper 1 - Course 1

Poetry and Prose

Block - 1 Unit 1-4

باب:1 اکائیاں: 1-4

اردو ادب : اختیاری مضمون

بی اے ،تین سالہ ڈگری کورس

سالِ اوّل - بی اے - پرچہ اوّل

نظم ونثر

(بلاک:1۔اکائیاں: 1-4)

١۔ شیخ الجامعه

پروفیسر کے ۔یس رنگاپا

٢۔ ڈین اکاڈمك

پروفیسر۔ جگدیشه

٣۔ فیکلٹی ممبرس

١۔ یم بلقیس بانو؛ صدر شعبہ اردو وکوآرڈینیٹر ، کے یس او یو، میسور

٤۔ ڈاکٹر جهاں آراء بیگم؛ پروفیسر شعبہ اردو، کے یس او یو۔ میسور

٤۔ اراکین بورڈ :

١۔ بلقیس بانو۔ یم، چیئر پرسن (یو جی (بی اویس))

٢۔ پروفیسر جهاں آراء بیگم ممبر۔

شعبہء اردو، کے یس او یو، میسور

٣۔ پروفیسر محمد صبغت الله ممبر۔

موظف پرنسپل گورنمنٹ بوائز کالج ،کولار، کے جی یف

٤۔ پروفیسر نصرت جهاں ممبر۔

مہارانیس آرٹس وکامرس کالج ،میسور

٥۔ پروفیسر محمد ثناء الله شریف ممبر۔

گورنمنٹ سرایم وی سائنس کالج ، بھدراوتی ،شیموگہ ضلع

٥۔ مصنفه :

بلقیس بانو یم۔ ،صدر، شعبہ اردو، کے یس او یو، میسور

٦۔ مدیر :

پروفیسر یس مسعود سراج ،ڈین فیکلٹی آف آرٹس،

صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف میسور، میسور

نصاب کا مقصد

یہ کتاب اردو ادب اختیاری مضمون کا ایک جزو ہے، جو بی اے، سال اوّل کے کورس میں رکھی گئی ہے، پہلے باب یعنی بلاک 1 میں دیوان غالب سے ردیف الف کی ۱۵ غزلیں دی گئی ہیں، غزلیات کے متن اور تشریح کے ساتھ ساتھ شاعر کا تعارف، غزل گوئی اور غزل گوئی کی اہمیت اور شاعر کے کلام کی امتیازی خصوصیات بھی پیش کی گئی ہیں، تا کہ نصاب میں شامل غزلیات سے آپ لطف اندوز ہوں اور بھرپور استفادہ کریں۔

یہ باب 4-1 اکائیوں پر مشتمل ہے۔

مذکورہ باب نظم کے لئے مختص ہے، سال اوّل بی اے کے اختیاری مضمون کے کورس میں یہ نصاب شامل ہے، اس کے علاوہ اس باب میں طلبہ کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے منتخب سوالات بھی دیئے گئے ہیں، تا کہ طلبہ اس سے مزید مستفید ہو سکیں، ہر اکائی میں مشکل الفاظ آئے ہیں، ان کے معنی بھی دیئے گئے ہیں اور اکائی کے آخر میں سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، اُمید ہے کہ طلبہ انہیں حاصل کر کے پڑھیں گے، اور نیز اپنی معلومات کو بڑھائیں گے۔

باب ۔ ۱

یہ باب بی اے سال اوّل کے اختیاری مضمون کے لئے مخصوص ہے اور اردو نظم کا ایک جزو ہے، یہ باب 4-1 اکائیوں پر مشتمل ہے، یعنی کل 04 اکائیاں۔

اکائی ۱: کے تحت غزل کی تعریف وخصوصیات، غزل کی نشو ونما، غالبؔ کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی ۲: کے تحت غالبؔ کی پانچ غزلیں اور انکی تشریح یعنی 1-5 یہ غزلیں ردیف الف سے لی گئی (یعنی دیوان غالبؔ) ہیں، تشریح اور مرکزی خیال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکائی ۳: کے تحت غالبؔ کی پانچ اور غزلیں یعنی 6 تا 10 ردیف الیف سے ہی لی گئی ہیں، متن کے ساتھ تشریح بھی دی گئی، اور بین السطور میں اس کے مرکزی خیال پر بھی روشی پڑتی ہے۔

اکائی ۴: کے تحت ردیف الف سے ہی پانچ اور غزلیں یعنی 11 تا 15 لی گئی ہیں، متن اور اس کی تشریح بھی دی گئی ہے، ان غزلیات کے مطالعہ سے غالبؔ کے کلام کی امتیازی خصوصیات کی ایک جھلک ضرور سامنے آجاتی ہے۔

مذکورہ باب میں جتنی بھی اکائیاں ہیں ان میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، ہر اس اکائی سے متعلق دیگر تفصیلات پر بھی معلومات فراہم کئے گئے ہیں، تاکہ طلبہ کو اکائی کے سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو۔

مشمولات

حصہ نظم : باب 1 ۔ اکائیاں (1-4)

مصنف : مرزا غالبؔ

کتاب : دیوانِ غالبؔ (ردیف الیف کی پندرہ غزلیں) (۱۵۔۱)

اکائی نمبر	عنوان
1 اکائی	(i) فن غزل گوئی
	(ii) غالبؔ کی حیات اور شاعری
2 اکائی	غالبؔ کی پانچ غزلیں اور تشریح (1-5)
3 اکائی	غالبؔ کی پانچ غزلیں اور تشریح (6-10)
4 اکائی	غالبؔ کی پانچ غزلیں اور تشریح (11-15)

اکائی .1(۱) فن غزل گوئی

(۲) غالبؔ کی حیات اور شاعری

ساخت

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تمہید

1.2 (ا)غزل کی تعریف وخصوصیات

1.3 غزل کی نشوونما

1.4 (۲) غالب حیات اور حالاتِ زندگی

1.5 غالب اوران کے ادبی کارنامے

1.6 غالب کی شاعری

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہءامتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 سفارشی کتب

1.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کومکمل کرنے کے بعدآپ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

☆ فن غزل گوئی کی تعریف،خصوصیات،موضوعات ونشوونمابیان کرسکیں۔

☆ غالبؔ کی زندگی اورادبی کارناموں پرروشنی ڈال سکیں اورنیز غالبؔ کی شاعری اوران کی عظمت پراظہارکرسکیں۔

1.1 تمہید :

اس اکائی میں غزل کی تعریف اس کی خصوصیات، اس کی درجہ بہ درجہ ترقی نیز غالب کی حیات کے اہم پہلوان کے فارسی واردو کے ادبی کارنامے ان کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ آپکو ضرور اندازہ ہوگا کہ غالب کی شاعری اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہر دور میں کیا گیا ہے، اور آج بھی کیا جارہا ہے، اس اکائی کے مطالعے سے غالب اور غالب کی شاعری کی اہمیت کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی۔

1.2 غزل کی تعریف و خصوصیات :

غزل اردو شاعری کی ایک اہم اور نہایت مقبول صنف سخن ہے، دیگر اصناف سخن کی طرح غزل بھی عربی کی دین ہے، عربی اور فارسی میں قصیدہ کی "تشبیب" میں عام طور پر حسن وعشق کے موضوع قلم بند ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ترقی پا کر تشبیب کی حیثیت ایک الگ صنف سخن کی ہوگئی اور غزل کہلائی جانے لگی۔ غزل کے معنی عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں، لیکن ادبی اصطلاح میں غزل "وہ صنف شاعری ہے جس میں عشقیہ موضوعات کے علاوہ تصوف، اخلاق فلسفہء حیات، مظاہر فطرت کے مضامین بھی پیش کئے جاتے رہے ہیں"۔

1.2.1

ہئیت کے اعتبار سے غزل ایک پابند نظم ہوتی ہے، جس کے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ ہم قافیہ اور اکثر ہم ردیف ہوتا ہے، غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے، جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں، کبھی کبھی دوسرے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں، اسے مطلع ثانی کہا جاتا ہے، اس کے بعد اشعار میں دوسرا مصرعہ مطلع کا ہم قافیہ ہوتا ہے، قافیہ کے ساتھ ردیف بھی لائی جاتی ہے، یعنی ایسے الفاظ یا افعال جن کی ہر شعر میں تکرار ہوتی ہے، غزل کا آخری شعر جس میں شاعر

تخلص لاتا ہے، اسے مقطع کہتے ہیں۔غزل کا اچھا شعر "شاہ بیت یا بیت الغزل" کہلاتا ہے۔غزل کے اشعار کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم وزن بھی ہوتے ہیں، اور وزن طے کرنے کے لئے بحریں بھی تخلیق کی گئی ہیں۔بحریں چھوٹی، بڑی کئی طرح کی ہوتی ہیں۔یہی وہ کیفیت ہے جس سے غزل کی ہئیت اور اس کے خد و خال کا تعین ہوتا ہے۔نظم کی طرح اس میں کسی مرکزی خیال یا ایک جذبہ کا بیان نہیں ہوتا۔ہر شعر اپنے اندر ایک اکائی اور ایک وحدت رکھتا ہے اور شعر میں پیش کردہ خیال دوسرے اشعار سے جداگانہ ہوتا ہے۔

1.2.2 اور جب ہم صنف سخن کی حیثیت سے غزل کی بات کرتے ہیں تو اس وقت غزل کا محض فنی پہلو ہمارے سامنے نہیں ہوتا بلکہ غزل تمام و کمال ہمارے سامنے ہوتی ہے۔غزل کے شعر کے لئے موزونیت کا ہونا ضروری ہے یعنی کلام کے موزوں ہونے سے مراد یہ کہ وہ ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کردیا جائے جن کو ادا کرتے وقت آواز میں ایک تسلسل یا ترنم پیدا ہوجائے اور جن میں باہم ایک لذت محسوس کریں، اور ساتھ ہی موزونیت سے شعر میں ہمارے جذبات کو متحرک کرنے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے، اس سے شعر کے حسن و اثر میں اضافہ ہوتا ہے، اور آسانی سے ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

1.2.3 اردو و فارسی میں اصناف کی ہئیت بڑی حد تک اشعار کی تعداد اور قافیوں کی ترتیب و نوعیت سے طے کی جاتی ہے، ہر دور کی تقاضے الگ ہوتے ہیں، ہر دور میں زمانے کے رواج کے مطابق تعداد اشعار میں کمی بیشی لائی جاتی ہے، کبھی مختصر ترین تو کبھی مختصر اور کبھی طویل اور کبھی غزل در غزل کبھی قافیہ بند غزل تو کبھی دوغزلہ، سہ غزلہ تو کبھی چوغزلہ کے نمونہ بھی ملتے ہیں، ایجاز و اختصار غزل کے لئے ضروری سمجھا گیا ہے، اس لحاظ سے طوالت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، غزل میں کم سے کم پانچ اشعار اور زیادہ سے زیادہ اکیس ۲۱ اشعار ہونے چاہئیں، عام طور پر مختصر غزلیں زیادہ مقبول رہی ہین، اور خاص و عام کی زبان پر چڑھی ہوتی ہے۔

1.2.4 غزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تخصیص کو تعمیم میں تبدیل کر دیتی ہے، شاعر اپنے مخصوص تجربے کو عمومی تجربہ بنا کر پیش کرتا ہے، یعنی وہ مخصوص واقعے یا حادثے (تاریخی یا معاشرتی) وغیرہ کو اپنی شخصیت سے آمیز کر کے ایک ایسی شکل عطا کرتا ہے، جس سے اس واقعے یا تجربہ کی نوعیت بدل جاتی ہے، جس سے سننے والے کو شاعر کا تجربہ اپنا تجربہ معلوم ہوتا ہے، اور اس کا ذہن فوری ایسے واقعات وحادثات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس طور پر غزل کی رمزیت اور اس کی مخصوص اشاراتی زبان شاعر کے مخصوص تجربے کو عمومی رنگ دینے میں اہم رول ادا کرتی ہے، اور غزل میں تعمیم کا پہلو آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتا ہے، اور ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق شاعر کی واردات کو اپنی واردات سمجھتا ہے۔

غزل میں زبان و بیان لہجہ وغیرہ سیدھا سادا ہونا چاہئے جس سے مخاطب بہ آسانی سمجھ جائے ثقیل الفاظ کی بھرمار نہ ہو غزل کا ہر شعر دراصل کسی خاص جذبے یا احساس کی انتہائی شدت کا مکمل لیکن مختصر ترین اظہار ہوتا ہے، اسلئے یہاں شاعر کو الفاظ کے انتخاب میں حد درجہ مہارت، احتیاط اور تخلیقی صلاحیت سے کام لینا ہوتا ہے، اختصار اور ریزہ کاری کے باوجود یہ بڑی جامع صنف ہوتی ہے یہ اشاروں کا فن ہے، اس میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہو سکتی، غزل خالص داخلی صنف ہے، ایک احساس کا اظہار ہے، یہ کوئی داستان نہیں ہے جسے کھول کر بیان کرنا پڑے، غزل کے مضامین کا تنوع بھی غزل کی داخلیت کا تقاضہ ہے، داخلی تجربات و کیفیات میں منطقی ربط و تسلسل ہو ہی نہیں سکتا۔

1.2.5 لہٰذا غزل میں ہر طرح کے جذبات و احساسات تجربات و کیفیات جگہ پا گئے ہیں، کیونکہ موضوع کی کوئی قید نہیں ہے، اور داخلی صنف ہونے کے باعث اس میں حسن و عشق کی نیرنگیاں، عشق مجازی و حقیقی انسانی زندگی کے مختلف مسائل، غم جاناں، غم دوراں، ندیم و رقیب، کفر و ایماں، شراب شباب، جام جم، جام سفال، وطن کے مسائل، اسرارِ خودی، نشاط بے خودی، شمع و پروانہ، بارش و برق، شام و سحر، وحشت و صحرا، قاتل و مقتل، بادہ و ساغر، گلچیں، وطائر، ہتوڑا، چٹان، دریچہ، درانتی، در،

تیشہ، گردش، ایّام، موسم آلام، سحر خزاں، نظارہ ءزوال وغیرہ غرض ہر موضوع نے اس تنگنائے میں اپنی جگہ بنالی ہے۔

غزل نے دکنی دور سے لے کر عہد حاضر تک ایک طویل سفر طے کیا ہے، اس صنف میں بڑی لچک ہے، اس نے اپنے بنیادی خط و خال کو قائم رکھتے ہوئے وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کیا، زندگی کے ہر رنگ کو اپنایا، طرزِ فکر اور طرزِ اظہار کی سطح پر تبدیلیاں آئیں اس طرح غزل کا دائرہ تنگ ہوتے ہوئے بھی موضوعات اور خصوصیات کے تنوع سے وسیع اور وسیع تر ہو گیا۔

1.3 غزل کی نشو ونما :

غزل وہ صنف سخن ہے جس کا وجود سوائے فارسی کے اور کہیں نہیں ملتا، فارسی کے ذریعے یہ اردو میں پہنچی، غزل کی داغ بیل سب سے پہلے ایران میں رودکی کے ہاتھوں پڑی جو آج بھی غزل کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، ورنہ اس سے قبل ایران کی شاعری میں قصیدے کا راج تھا، اور عشقیہ موضوعات نے اپنی جگہ بنالی تھی، شعراء اسی موضوع پر طبع آزمائی کرتے تھے، اسے عربی میں "نسیب" اور فارسی میں "تشبیب" کہتے ہیں، رودکی کی کوشش نے اس موضوع کو الگ کیا اور ترقی یافتہ زمانے نے اسے غزل کے روپ میں جانا اور پہچانا۔

عشقیہ شاعری کی یہ صنف ہمیں ایرانی شاعری سے ورثہ میں ملی، ہم نے نہ صرف غزل کی ساخت، ہیئت، اور خارجی اسلوب ورثے میں پایا بلکہ مضامین، موضوعات، تخیلات، مفروضات، تصورات اور علائم بھی ہمیں ورثے میں ملے ہیں، یہ صنف ایک زندہ صنف تھی اور زندگی کے امکانات سے بھرپور تھی دکن سے شمالی ہند میں پہنچنے کے بعد غزل متعدد ادوار اور بے شمار تغیرات سے گذری ہے۔

1.3.1

شمالی ہند میں غزل کی ابتداء امیر خسرو کے زمانے میں ہوئی اور دربار تک اس کی رسائی ہو چکی تھی، دکن میں صوفیائے کرام اور بادشاہ بھی غزل کہتے تھے، محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا

صاحب دیوان شاعر کہلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ غواصی، نصرتی، وجہی، سید میراں خدانما، برہان الدین جانم وغیرہ کی غزلیں ملتی ہیں، دکنی غزل میں ہندوستانی ماحول معاشرت، تہذیب اور سماج کی عکاسی ملتی ہے۔

ولی دکن سے شمالی ہند پہنچے تو شمال میں غزل کا رواج عام ہوا، اور ولی اردو، غزل کے باوا آدم کہلائے اس زمانے میں جعفر زٹلی وغیرہ بھی غزل کہتے تھے، ولی کے زمانے میں سادگی وسلاست کے ساتھ ایہام گوئی کا بھی رواج رہا، آرزو، آبرو، ناجی، مضمون، ایک رنگ وغیرہ نے یہی رنگ اپنایا، اس کے بعد استادان سخن نے زبان، الفاظ، اور محاوروں میں اصلاح کی طرف توجہ کی، شاہ حاتم، مظہر جان جاناں، اس سلسلے کے نمائندہ نام ہیں، یہ اردو غزل کا سنہری دور تھا، سادگی، صفائی، لطف واثر زبان و بیان میں دلکشی اور دلنشینی کو بہ خوبی پیش کیا گیا، ان کے بعد میر تقی میر، سودا، میر درد، میر حسن، مصحفی، انشاء، رنگین، جراءت وغیرہ نے طبع آزمائی کی اور اپنی اپنی امتیازی حیثیت بنائی، جرأت، انشاء، رنگین نے اردو غزل میں معاملہ بندی، سطحی جذبات اور مبتذل خیالات کو بھی پیش کیا، مگر اسی دور میں آتش و ناسخ، شاہ نصیر نے بھی اچھی شاعری کی۔ انہوں نے زبان اور شاعری کے اصول وقواعد بنائے سادگی اور شیرینی کے بجائے مضمون آفرینی اور ضائع کے استعمال پر زور دیا۔

1.3.2 انیسویں صدی سے غزل کا نیا دور شروع ہوتا ہے، غالب، رند، صبا، مومن، امیر و داغ، رشک، ذوق، ظفر وغیرہ نے روزمرہ محاورات میں صفائی سادگی سلاست، روانی، بلند مضامین، نادر خیالی، انداز میں جدت، جدید ترکیبیں اور نئی نئی تشبیہات بھی کثرت سے استعمال کیں، یہ سبھی نام اپنی اپنی جگہ مستقل اداروں کی حیثیت رکھتے تھے، گو ان کا طرز اظہار ایک دوسرے سے جداگانہ تھا۔

پھر حالی کی اصلاحی تحریک شروع ہوئی، انہیں غزل کا دامن تنگ نظر آیا، وسعتِ بیان کی

طرف توجہ دی، غالبؔ و اقبالؔ کی شاعری میں اردو غزل خود سے اور خدا سے گفتگو کرنے لگی، عشق حقیقی، خودی، فلسفہ، مذہب، تصوف وغیرہ ہر موضوع غزل میں جگہ پانے لگا، اس کے بعد چکبستؔ، جوشؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، فراقؔ، یگانہؔ، ریاضؔ، جلیلؔ، صفیؔ، سیمابؔ، شاد عارفیؔ، شادؔ عظیم آبادی، حفیظؔ، فانیؔ، جگرؔ، ساغرؔ وغیرہ نے سنجیدگی، پاکیزگی، زندگی کے حقائق، قومیت و وطنیت اور تمام انسانی جذبات کو غزل میں بیان کیا ہے، جس میں نزاکت و لطافت جوش و خروش، درد و اثر، سوز و گداز، محبت و خلوص، سادگی و اصلیت سب کچھ ہے، انہوں نے جدید خیالات کی آمیزش سے غزل میں نیا رنگ جمایا غزل حسن و عشق کے دائرے سے نکل کر زندگی کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

1.3.3 صنف غزل جو کہ ایران کی شاعری سے ہمارے ہاتھوں تک پہنچی تھی، ایک زندہ صنف تھی، اور زندگی کے امکانات سے بھرپور تھی، اور یہ مختلف ادوار اور بے شمار تغیرات سے گذری ہے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ سرسید تحریک کے بعد اردو ادب میں دوسری جاندار تحریک تھی، یہ تحریک ایک منظم واضح اور سلجھا ہوا نظریہء ادب اپنے جلو میں لئے ہوئے اٹھی۔ اس تحریک کے آغاز سے غزل میں مبالغہ آرائی خیال بندی، اور الفاظ کی پیچیدہ ترکیبیں فرسودہ ہوگئیں، اردو غزل کا دامن وسیع تر ہوگیا، نظم گو بھی غزل کہنے لگے، فیضؔ، مجازؔ، سردار جعفریؔ، ساحرؔ لدھیانوی، احمد ندیمؔ قاسمی، جاں نثار اخترؔ، مخدوم محی الدین جذبیؔ، تاباںؔ، خلیل الرحمٰن، اعظمیؔ، جگن ناتھ آزادؔ، بشیر بدرؔ، احمد فرازؔ، میراںؔ جی، شہریارؔ، ظفر اقبال، باقیؔ، ناصر کاظمیؔ، یوسف ظفرؔ، شاذ تمکنتؔ، مظفر حنفیؔ، حسن تعیمؔ، عمیق حنفیؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، کشور ناہیدؔ، پروین شاکرؔ، وحید اخترؔ، ندا فاضلیؔ وغیرہ نے غزل کے دامن کو وسیع کیا، نئے مسائل اور نئے سماجی محسوسات سے ہم کنار کیا، اس طرح غزل اپنے ابتدائی دور سے لے کر عہد حاضر تک مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی آئی، کسی نے اس کی گردن زدنی کا فتویٰ صادر کیا تو کسی نے نیم وحشی صنف کہہ کر اس کی عظمت کو للکارا مگر رشیدؔ احمد صدیقی اسے اردو شاعری کی آبرو قرار دیتے تھے، بلاشبہ غزل اپنی جامعیت کے اعتبار سے نہایت کارآمد اور بہترین صنف سخن ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ او ر نمونہ جوابات

سوال ۱: اردو غزل کی تعریف کیجئے۔

سوال ۲: غزل کی ہئیت و موضوعات پر روشنی ڈالئے۔

سوال ۳: غزل کی نشو ونما کا جائزہ لیجئے۔

جواب کے لئے: 1.2.1، 1.2.2، 1.2.3، 1.2.5، اور 1.3 کے تحت دیکھئے۔

1.4 غالبؔ کی حیات اور حالات زندگی:

مرزا اسد اللہ خاں غالب نام مرزا نوشہ عرفیت، نجم الدولہ دبیر الملک خطاب تھا، نام کی مناسبت سے اسدؔ اور غالبؔ تخلص اختیار کیا تھا، ۱۷۹۷ء بہ مقام آگرہ (اکبر آباد) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی، اور تیرہ سال کی عمر میں مستقل طور پر دہلی میں قیام کرنے لگے تھے، آبائی پیشہ فنِ سپہ گری تھا، کم سنی میں والدین فوت ہوگئے، اس کے بعد ان کی نگرانی اور پرورش انکے چچا مرزا نصر اللہ نے کی، اور تقریباً نو برس کی عمر کے ہوئے تو ان کے چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، بہت ہی کم عمری میں انہیں مختلف حادثوں سے دو چار ہونا پڑا، غالب ننھیال میں پرورش پانے لگے، دہلی میں قیام کے بعد غالب نے اپنی زندگی میں بڑی مصیبتوں کا سامنا کیا، چچا کے انتقال کے بعد ایک جاگیر کے عوض سات سو پچاس روپیئے سالانہ پنشن ملتی تھی، اور یہی انکے لئے ذریعہ معاش تھا، غالب مالی اعتبار سے کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہے، ہمیشہ پریشانیوں نے انہیں گھیر رکھا، لیکن وہ انتہائی خوش مزاج تھے، انکے کئی لطیفے مشہور ہیں۔

ان کی شادی کم عمری ہی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی امراؤ بیگم سے ہوگئی تھی، آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر دہلی میں رہتے تھے، اس نقل مکانی سے ان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، اچھا ماحول ملا، اور بڑے بڑے لوگوں سے میل جول بڑھا، ان میں خصوصاً شیفتہؔ، آزردہؔ، صہبائیؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ وغیرہ۔

1.4.1 وہ شاہی دربار سے وابستہ ہوئے ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے انہیں اپنا استاد مقرر کرلیا، تنخواہ مقرر کی، اور خلعت سے نوازا بھی اور اپنے کلام کی اصلاح بھی لیتے تھے، اور انہیں داستان تیموری لکھنے کا کام سونپا، اسی زمانے میں واجد علی شاہ نے پانچ سو روپیئے دربار سے مقرر کئے، مگر زیادہ دن فائدہ نہ اٹھا سکے، غدر نے سارے حالات درہم برہم کردئے، یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد غالب کی پنشن بھی بند ہوگئی، پریشانیاں بڑھ گئیں چچا کی جاگیر کا سالانہ معاوضہ پنشن سب متاثر ہوئے، اور ذرائع آمدنی بند ہوگئے، اس سلسلے میں انگریزی حکومت سے کوشش کرنے وہ کلکتہ گئے، ملکہ اور انگریز عہدہ داروں کی شان میں قصیدے لکھے، لیکن سب بے کار دھرے کے دھرے رہ گئے، یعنی معاوضہ میں اضافے کے لئے ملکہء انگلستان کی خدمت میں اپیل کی، کلکتہ، کانپور، لکھنو، مرشد آباد، کا سفر کیا۔ مگر سب بے سود رہا اور مایوسی ہاتھ آئی، مرزا پر فقر و فاقہ کی نوبت آگئی، مالی پریشانیوں کے زمانے میں مولوی فضل حق، خیر آبادی، اور مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے دوستوں نے انکی مدد کی انہیں خوشحالی دیکھنی نصیب نہ ہوئی، آخری عمر میں صحت خراب رہنے لگی، جوانی کی بے اعتدالیوں اور کثرت شراب نوشی نے ان کی صحت تباہ کردی تھی، اور سخت بیمار رہنے لگے تھے، بے ہوشی کے عالم میں ۱۵ فروری، ۱۸۶۹ء میں دہلی میں فوت ہوئے۔

1.4.2 غالب کی شخصیت میں مختلف اوصاف رچے بسے ہیں، غالبؔ کو غالبؔ بنانے میں انکی زندگی کے واقعات اخلاق و عادات انکے مزاج کا بڑا دخل ہے، بقول حالی "غالبؔ کے اخلاق نہایت بلند تھے وہ ہر ایک شخص سے جوان سے ملنے جاتا تھا، بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، جو ایک بار ان سے ملنے آتا وہ ملنے کا خواہاں رہتا"۔ (یادگار غالب)

انکی تحریروں سے انکے کردار کی بلندی، جھلکتی ہے، غالبؔ کو شعر و شاعری کا چسکہ دہلی میں لگا تھا، چھوٹی سی عمر میں شعر کہنے لگے تھے، فارسی و اردو میں۔ غالب کا سسرال دہلی کے ممتاز خاندانوں میں تھا اسلئے ان کے فکر و فن تو خوب رونق نصیب ہوئی، غالب کی نجی زندگی کی ایک تصویر یہ بھی ہے کہ

یہ جس قدر بادہ خوار تھے، اتنی ہی پرہیز گاری انکی بیوی میں تھی، ان کی سات یا نو اولاد ہوئیں اور اللہ کو پیاری ہوگئیں، مگر دونوں میاں بیوی نے سوائے صبر کے گلہ شکوہ اپنے رب سے نہ کیا۔

1.4.3 غالب کا کردار اس قدر بلند تھا کہ اپنے دوستوں سے مل کر بے حد خوش ہوتے تھے، غدر سے پہلے ان کے ایک دوست کے حالات اچھے تھے متمول تھے لیکن غدر کے بعد حالات خراب ہوئے، جب یہ دوست غالب سے ملنے آئے تو غالب کو برا لگا اس لئے انہوں نے انکے پہنے ہوئے کرتے پر نظر کی اور کہا آپ نے یہ فرغل کہاں سے لی مجھے بہت پسند ہے اور بھلی لگ رہی ہے، یہ کہنے کے بعد اپنا قیمتی فرغل نکال کر انہیں دے دیا اور انکا معمولی کرتا آپ خود لے لیا۔ فراخ حوصلگی کے علاوہ وہ حق پسند، روادار، راست گفتار بھی تھے، غالبؔ کی شخصیت انکے کردار کا ایک اہم جزو تھی، اور حالی نے بجا طور پر کہا تھا کہ حیوان، ناطق کی جگہ حیوان ظریف کہنا زیادہ مناسب ہے، وہ اکثر اپنی زندگی کے مسئلے شگفتگی کے ساتھ حل کرنا چاہتے تھے، اور مزاح کے پیچھے انکا اتھاہ غم چھپا ہوا رہتا تھا۔

14.4 غالب کا انداز بیان اور طرز تکلم بھی نہایت شگفتہ تھا، رمضان کا مہینہ ایک سنّی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے عصر کا وقت تھا، مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا، مولوی صاحب نے پوچھا جناب کا کیا روزہ نہیں ہے، مرزا نے کہا، سنی مسلمان ہوں، چار گھڑی دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں، رمضان کا مہینہ گزر جانے کے بعد قلعہ میں بادشاہ کے پاس حاضری دی تو شاہ نے دریافت کیا کتنے روزے رکھے تو انہوں نے کہا پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

غالب کی نجی زندگی سے جو حادثات وابستہ ہیں انہیں خود پر حاوی نہ کیا بلکہ شوخی و ظرافت میں اپنی پناہ ڈھونڈھ لی، غالب کی شخصیت اور زندگی کا بڑا پن اس میں ہے کہ انہوں نے ناسازگار حالات کا مقابلہ نہایت ہمت، جرأت، و حوصلہ سے کیا، سعی پیم انکا شیوہ تھا، اور کچھ پانے اور حاصل کرنے کی تمنّا میں انہوں نے زندگی گزاری۔

1.4.5 غالب کی طبیعت میں ذہنی جدت اور اختراع بھی خوب تھی، اور حافظہ بھی بلا کا تھا، کہا جاتا ہے کہ انکے گھر میں کتاب کا نام ونشان نہ تھا، کرائے پر کتابیں لینے اور پڑھنے کے بعد واپس کردیتے جو کام کی باتیں ہوتیں، اسے ذہن نشین کر لیتے، اور فکرِ شعر کا بھی ایک عجیب طریقہ تھا، رات کو عالم جنون میں شعر کہتے جاتے تھے اور جب کوئی شعر موزوں ہوتا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے، تھے اسی طرح غزل کی غزل گرہوں میں باندھ لیتے اور سو جاتے، صبح میں اٹھ کر ایک ایک گرہ کھولتے جاتے تھے اور یاد کر کے اسے صفحہ قرطاس پر رقم کرتے جاتے تھے،

1.4.6 غالب کی زندگی میں بلکہ انکی شخصیت میں ایک جدت پسندی یہ بھی تھی کہ وہ پرانی روش پر چلنا مناسب تصور نہیں کرتے تھے، انکی شخصیت اور تحریروں میں زمانے کے جور وستم اور تہذیبی اثرات کا عکس بھی ہے، فلسفہ بھی ہے تصوف بھی، زندگی کی تمام تر رنگینیاں اس میں شامل ہیں، اور انکی زندگی کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہیں۔ غالب کی زندگی کا ایک عمدہ اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، تنگ دل نہ تھے، دادِ سخن دینے میں کبھی کنجوسی نہ کی، مومنؔ کے شعر کی دل کھول کر تعریف کی اور شعر کے بدلے اپنا اردو دیوان دینے پر راضی تھے، مومن کا یہ شعر غالب کو بے انتہا پسند تھا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالبؔ کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی اس میں کوئی دو رائے نہیں جس دور میں انہوں نے آنکھیں کھولیں وہ مغلیہ سلطنت کا زوال یافتہ دور تھا، ایک تہذیب مٹ رہی تھی اور دوسری تہذیب کا جنم ہو رہا تھا، مسلمان انگریزی حکومت کے تابع اور انکے عتاب کا شکار ہوئے بادشاہت ہاتھ سے نکل گئی، اقتدار چلا گیا، غلامی کی زنجیروں میں کسے گئے، ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد غالب خانہ نشین ہو گئے، مگر اپنا حوصلہ اپنی ہمت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، وہ ترکی تھے اور آبائی پیشہ فن سپہ گری تھا، مگر حالات نے ان کے ہاتھ میں تلوار نہ پکڑائی، بلکہ قلم سے تلوار کا کام لیا۔

1.4.7 حالات کی ستم ظریفی نے انکی شخصیت کو مسخ نہ کیا، ہمیشہ شاہانہ بلکہ امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے، امیرانہ ماحول کی عیش پسندی وضعداری بچپن کا الہڑ پن جوانی کے نت نئے شوق ان کے مزاج میں رچ بس گئے تھے۔ بہر حال غالب کی شخصیت اور حیات کے مختلف پہلوؤں کے مطالعے کے بعد ہمارے اندر ایک نئی امنگ کروٹ لیتی ہے، ایک حوصلہ، جرأت اور ہمت پیدا ہوتی ہے، زمانے کی بندشوں سے آزادی کا احساس ہوتا ہے، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ غالب کی زندگی کشمکش جدوجہد اور سعی پیہم سے عبارت تھی، انہوں نے حالات کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا، زمانے کو خوب جانچا پرکھا اور اسے اپنے فکر کا موضوع بنایا، غالب نے ہر غم کو اپنے اندر ضم کر کے اپنی شخصیت کو سنوارا اور اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنی انفرادیت کی دھاک بٹھائی۔

1.5 غالب اور ان کے ادبی کارنامے :

ادیب اور شاعر کی شخصیت اس کی تخلیقات میں پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے، اور یہ بات غالب پر خوب صادق آتی ہے، ان کی تخلیقات انکی شخصیت کی آئینہ دار ہیں، ان کی شخصیت کے اثرات ان کے نظم ونثر میں ملتے ہیں، مرزا غالب نے فارسی اور اردو نظم ونثر میں درج ذیل کا نامے پیش کئے ہیں، انکا بیشتر کلام ہنگامہ غدر کی نذر ہو گیا اور جو بچا اسے ان کے دوست واحباب نے اکٹھا کر کے شائع کروایا۔

1.5.1 فارسی نظم و نثر :

(۱) کلیات فارسی ۱۸۳۵ء میں میخانہء آرزو کے نام سے ترتیب ہوا مگر بعنوان کلیات غالبؔ کے ۱۸۴۵ء میں چھپا۔

(۲) سبد چین: ۱۸۶۴ء میں غالبؔ کا متفرق کلام چھپا۔

(۳) متفرقات غالب: مرزا غالب کے کچھ فارسی خطوط اور فارسی نظموں کو اکٹھا کر کے مسعود حسن رضوی ادیب نے ۱۹۴۷ء میں شائع کروایا۔

(۴) پنج آہنگ: یہ غالبؔ کی سب سے پہلی نثری تحریر ہے، ۱۸۲۵ء میں جب بھرت پور پر انگریز قابض ہوئے تو اس وقت ان کے بیوی کے بھائی نے فرمائش کی (جو کہ فوج میں تھے) کہ وہ القاب وآداب خطوط نویسی کا ذکر ہو اور ایک ہی کتاب کے مطالعہ سے سیر یابی ہو لہٰذا اس فرمائش پر یہ کتاب لکھی اور اس کے پانچ حصے بنائے اور ہر حصے کا نام آہنگ رکھا، یہ تصنیف ۱۸۴۹ء میں چھپی۔

(۵) مہر نیم روز: غالبؔ کی دربار تک رسائی نہ ہوسکی تھی، گاہے گاہے مشاعروں کے لئے غزلیں لکھتے اور شریک ہوتے تھے، ان کی رسائی صرف مشاعروں کی حد تک تھی، بادشاہ کے وزیر کی سفارش پر انہیں تاریخ تیموریہ لکھنے کا کام سپرد کیا گیا، اور شاہی مورخ کی حیثیت سے انہیں دربار میں باریابی ہوئی اور اس کام کو مدنظر رکھتے ہوئے پچاس روپیئے ماہانہ مقرر کئے گئے، غالب نے مہر نیم روز ۱۸۵۴ء میں مکمل کی اس میں انہوں نے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھی ہے، بہادر شاہ ظفرؔ نے ان کے سپرد یہ کام ۱۸۵۰ء میں کیا تھا، ان کا مقصد یہ تھا کہ "پرتوستان" کے نام سے دو حصوں پر مشتمل تاریخ لکھیں گے پہلے حصے مہر نیم روز میں امیر تیمور سے ہمایوں تک حالات و واقعات قلمبند ہوں گے، اور دوسرے حصے " ماہ نیم ماہ" میں اکبر سے بہادر شاہ ظفر تک کے واقعات ہوں گے، بعد میں بادشاہ کے حکم پر واقعات کی فراہمی کے لئے حکیم احسن اللہ خان کو رکھا گیا، غالب کو یہ تاریخی معلومات فراہم کرنے اور غالب اسے اپنے طرز پر فارسی میں ڈھالتے گئے، ۱۸۵۰ء سے کام شروع کیا، غدر کے ہنگامہ تک جاری رہا اور ایک ہی حصہ چھپ پایا، یہ ۱۸۵۲ء میں مکمل ہو چکا تھا، اور ۱۸۵۴ء میں چھپا، لیکن غدر کی وجہ سے حالات بگڑ گئے، اور دوسرا حصہ مکمل نہ ہوسکا۔

(۶) دستنبو: گوشہء نشینی میں غدر کے حالات اس میں قلمبند کئے گئے ہیں یعنی مئی ۱۸۵۷ء سے اگست ۱۸۵۷ء تک کے حالات و واقعات لکھے گئے ہیں:

(۷) قاطع برہان: ۱۸۶۰ء میں غالب نے مکمل کیا، اس کتاب میں محمد حسین تبریزی کی کتاب برہان قاطع پر اعتراضات کئے ہیں،

(۸) درفش کاویانی: یہ قاطع برہان کا دوسرا ایڈیشن ہے حذف واضافہ وترمیم کے ساتھ شائع کروایا۔

(۹) گل رعنا: فارسی و اردو کلام کا انتخاب ہے، ۱۸۲۸ء میں شائع ہوا، یہ اپنے عزیز دوست مولوی سراج احمد کی فرمائش پر منتخب کیا تھا۔

(۱۰) دعا الصباح: عربی زبان میں جو حضرت علیؓ سے منسوب ہے، اس کا ترجمہ غالبؔ نے کیا تھا یہ ترجمہ اپنے بھانجے محشرؔ کی فرمائش پر کیا تھا۔

(۱۱) ماثر غالب: ۲۳ بتیس خطوط فارسی اور کچھ مطبوعہ اردو فارسی تحریریں شامل ہیں۔

(۱۲) ابر گہر بار: چراغ دیر، بادِ مخالف، مثنویاں، قابل ذکر ہیں، ابر گہر بار خصوصی طور پر یہ نا تمام مثنوی ۱۸۶۴ء میں میر کلیم غلام رضا خان کے اصرار پر علیحدہ شائع کروائی، یہ طویل مثنوی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک ہزار ایک سو اشعار ہیں غالبؔ نے اسے شاہ نامہ فردوسی کے رنگ میں لکھنا چاہا مگر نہ ہوسکا اسی لئے اسے کتاب کی صورت میں الگ سے چھاپا کیونکہ اس میں کافی حصہ حضور اکرم کے معراج کے واقعے پر مشتمل تھا۔

1.5.1 اردو نظم و نثر :

غالبؔ نے جب اپنے رنگ سخن کو اپنے دوستوں کے کہنے سے بدلا تو ساتھ ہی دوستوں کے مشورہ پر خاص طور پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے کہنے پر غالب نے اپنا اردو دیوان ترتیب دیا اور ایسے اشعار جنہیں لوگوں کو سمجھنے میں دقت تھی، انہیں خارج کر دیا۔ پہلی بار یہ انتخاب ۱۸۴۱ء میں اور حیات ہی میں تقریباً پانچ بار شائع ہوا، یعنی دوسری بار ۱۸۴۷ء، تیسری بار ۱۸۶۱ء میں چوتھی بار ۱۸۶۲ء اور پانچویں بار ۱۸۶۶ء میں اور وفات کے بعد اس کے بے شمار ایڈیشن نکلے اور شرحیں چھپیں، یہی غالب کا سرمایہء حیات ہے۔

(۲) نسخہء حمیدیہ: غالبؔ نے جس اصل دیوان سے انتخاب کر کے اپنا اردو دیوان تیار کیا تھا، اتفاق سے اس کا نسخہ میاں فوجدار خاں بہادر (بھوپال) کے کتب خانے میں محفوظ تھا، اسے مفتی محمد انوار الحق نے ۱۹۱۹ء میں پھر ۱۹۲۶ء میں بھوپال میں شائع کیا۔

(۳) نثر میں: عود ہندی: غالبؔ کے خطوط کا مجموعہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا، ممتاز علی میرٹھی نے شائع کروایا۔

(۴) اردوئے معلیٰ: ۱۸۶۹ء غالب کی وفات کے کچھ دن پہلے، غالب کے شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے شائع کروایا۔ اسی کا دوسرا حصہ انکے شاگرد خاص حالیؔ نے ۱۸۹۹ء میں ان کی وفات کے بعد شائع کروایا۔

(۵) نادرات غالب: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو غالب نے اپنے دوست منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے تھے، ان خطوط کو میر مہدی مجروح اور میر افضل علی میرن نے اکٹھا کیا تھا، افضل علی کے نواسے آفاق دہلوی نے ۱۹۴۹ء میں چھپوایا۔

(۶) مکاتیب غالب: والیانِ ریاست کانپور سے جو بارہ سال کے تعلقات تھے اور یہ تعلقات خطوط کے ذریعے قائم تھے لہٰذا غالب نے انہیں اکٹھا کر رکھا تھا، ان خطوط کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے مکاتیب کے نام سے ۱۹۳۷ء میں چھپوایا۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جوابات:

سوال ۱: غالب کا تعارف پیش کیجئے۔

سوال ۲: غالب کی شخصیت پر نوٹ لکھئے۔

سوال ۳: غالب کی فارسی تخلیقات پر روشنی ڈالئے۔

سوال ۴: غالب کے اردو نظم و نثر کے ادبی کارناموں پر اظہار خیال کیجئے۔

جواب کیلئے: 1.4، 1.4.1، 1.4.2، 1.4.3، 1.4.4 اور 1.5، 1.5.1 کے تحت دیکھئے۔

1.6 غالب کی شاعری:

مرزا غالبؔ نے ابتدائی زمانے ہی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا، بیدلؔ کے طرز پر کہتے تھے،

اورسب سے پہلے صنف غزل کی طرف توجہ دی، خوب شاعری کی، علم وادب کے مختلف گوشوں کو اپنی فکر کے سانچوں میں ڈھال کر انہیں خوب تراشا اور ادب نوازوں کے سامنے پیش کیا، اپنے عہد کے اور آئندہ دور کے ہر بڑے شاعر وادیب کو مات دے دی۔

شادی کے بعد اپنے خسر (الٰہی بخش معروف) جو نواب احمد بخش خان والئ فیروز پور کے رئیس کے چھوٹے بھائی تھے، شعر وادب کا عمدہ شوق رکھتے تھے اور اسی سبب انکے ذریعے سے جو ادبی وعلمی ماحول ملا اس سے خوب استفادہ کیا۔ ان کے خسر خود بھی شاعر تھے، اور مختلف مشاعروں میں اپنے داماد کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے تھے، اس لحاظ سے اپنی فکر کو خوب روشن وتابندہ کیا۔

1.6.1 غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی جیسے قصائد، مثنویاں، قطعات، منقبت، حمد ونعت، مرثیہ وغیرہ، اور ہر جگہ اپنی امتیازی حیثیت بنائی، ذوقؔ کا چرچا تھا، جب غالبؔ نے شاعری شروع کی تھی، اس وقت انہیں اردو باعث ننگ اور بے رنگ وبولگی اور فارسی گلہائے صد ہزار رنگ، جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں کہا غالبؔ نے بیدلؔ کے طرز میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اردو میں فارسی کے بعد بیدلؔ ہی کا رنگ وروغن ملتا ہے، جس کا اعتراف خود انہوں نے کہا ہے کہ:

طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خان قیامت ہے

بیدلؔ کے بعد میر تقی میرؔ کے طرز سخن کو اپنایا اور انکی شہرت انکی اردو تحریروں ہی کی وجہ سے آج بھی قائم ودائم ہے، غالب نے اپنے دوستوں کے کہنے پر اپنے رنگ سخن کو بدلا اور فارسی آمیز اردو کے بجائے آسان اردو میں شعر کہنے کو مشکل تصور کیا، کیوں کہ یہ ان کی طبیعت کے اقتضا کے خلاف تھا، رباعی ملاحظہ ہو۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل و گرنگویم مشکل

غالبؔ کے دیوان میں مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان غزلیں ملیں گی، غالبؔ نے غزل کو نئی جدتوں سے آشنا کیا، حسن ادا کے ساتھ مضمون کو خوبصورتی سے پیش کرنے کا ملکہ بھی تھا، غالب نے غزل میں زبان و بیان کا ایک خاص اسلوب ایجاد کیا ہے، جس کو انہی سے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔

حسن و عشق کے موضوع پر غالب نے خوب لکھا ہے، اس میں تنوع و گہرائی بھی ہے، کبھی محبوب عدو تو کبھی دوست، کبھی طنز تو کبھی اظہار افسوس تو کبھی محبوب کی بے التفائی کبھی شکوہ تو کبھی ہجر و وصل کی بات تو کبھی کچھ اور۔

۱ سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

۲ شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصور کے پردے میں بھی عریاں نکلا

۳ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

1.6.2 غالبؔ اپنے کلام میں تشبیہات و استعارات خوبصورت طریقے سے استعمال کرتے ہیں، اس میدان میں بھی غالبؔ کا انداز بیان سب سے نرالا ہے، اور یہ غالب کی شاعرانہ تخلیق اور فنکارانہ صلاحت کا اشاریہ ہے، غالب خوبصورت تشبیہات استعمال کرتے ہیں، انکی خوبصورت تشبیہات سے متاثر ہوکر کسی نے انہیں "تشبیہات کا بادشاہ" قرار دیا تھا، اس خصوص میں غالبؔ نے شعر میں معنی آفرینی، اختصار، جامعیت و بلاغت کے ساتھ ایک جدت و طرز ادا کی خوبی کا احساس دلایا ہے، مثلاً

۱ ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہوجانا

۲ قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوار زندان ہوگئیں

غالبؔ کے کلام میں اکثر و بیشتر، الفاظ وتراکیب کی تکرار سے ایک خاص ترنم پیدا ہوتا ہے، اوراس میں موسیقی کا احساس ہونے لگتا ہے، اور ساتھ ہی دیوان کا ہر مصرعہ، تار رباب نظر آتا ہے، (محاسن کلام غالبؔ) غالب کے مناسب الفاظ وتراکیب کی نشست سے رعنائی ودلکشی پیدا ہوتی ہے ،اوراشعار میں معنویت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے غالب نے ایک جگہ لکھا تھا کہ "شعر میں قافیہ پیمائی کے بجائے معنی آفرینی کو جگہ دی جائے"، نفسیات کا تجربہ وتجزیہ، فلسفہ، رموزِ حقائق، تصوف کے مسائل، کائنات کا تصور سب کچھ جگہ پا گئے ہیں ان کی شاعری میں، مثلاً

1۔جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
2۔مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا میرے آگے
3۔ بازیچہء اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
4۔نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
5۔یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
6۔ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
7۔ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم — ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

1.6.3 غالبؔ کی شاعری میں شوخی وظرافت بھی ہے اوراس طرز سے ان کے کلام میں وسعت وہمہ گیری پیدا ہوتی ہے، غالب نے جس کسی موضوع پر لکھا چاہے وہ تصوف ہو چاہے فلسفہ، حسن وعشق کی عشوہ طرازی ہر موضوع میں اپنا مخصوص شوخی وظریفانہ انداز شامل کرنا نہیں بھولتے۔

1۔بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر
2۔ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

3۔میں نے کہا بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

4۔دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک نگہ میں رضا مند کر گئی

5۔گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

6۔اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

7۔وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

غالب کی شاعری میں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں، شعر کے سانچے میں رعایت، لفظی کے ساتھ جذبہ و خیال کو پیش کرتے ہیں، انکے یہاں تک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی اور خیال آفرینی ملتی ہے، اور اس کے لئے انہوں نے اشارہ و کنایہ کا استعمال بلا تکلف اور خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔

دل لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا۔

1.6.4 مرزا کے کلام میں ذاتی جذبات کی ترجمانی بھی ہے، انکے اشعار ان کے خیالات کی آئینہ داری کرتے ہیں، وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں، کہیں خدا پر پورا اعتماد تو کہیں تعلقات دینوی سے دلی وابستگی اور کہیں دنیا سے نفرت و بیزاری مثلاً

1۔زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

2۔پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم ِ تحریر بھی تھا

غالبؔ کے کلام میں بلا کی سادگی سلاست روانی اور نازک مزاجی ملتی ہے، انکے اشعار نفسِ شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روحِ رواں ہیں، سیدھے سادے الفاظ اور اس کی تہہ میں گہری معنویت ہے یہ غالب ہی کا کمال ہے۔

1۔نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہوگئیں

2۔ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

3۔ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا　　صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

4۔گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالب لفظی شعبدہ بازی کے قائل نہ تھے، غالب نے اپنی جدت ادا سے معنی ومفہوم کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے، ان کا کلام مختلف موضوعات کا ایک خزانہ ہے، غالب کے کلام میں حسن وعشق سے متعلقہ مضامین، تصوف کے مسائل، نادر تشبیہات، نئے استعارے، جدت ادا، ندرت خیال، انداز بیان کی نزاکتیں، معنی آفرینی، لطافت زبان کے ساتھ ذاتی زندگی کے تجربات، احساسات وجذبات کی عکاسی ملتی ہے۔اس میں جدوجہد، عمل اور سعی پیہم کی کامیاب کوشش ملتی ہے، انہوں نے اپنے دیوان کو گنجینہء معنی کا طلسم قرار دیا۔ غالب اپنے طور پر ایک عہد ایک ادارہ تھے اپنے طرز کے موجد بھی تھے، اور خاتم بھی، انہوں نے شاندار طریقے سے بلکہ پورے کمالِ فن کے ساتھ اردو میں لکھا اور بلاشبہ غالب قادرالکلام زندہ جاوید شاعر تھے، اور یقیناً دنیائے ادب پر غالب رہیں گے۔

1.7 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپ کو اردو غزل کے متعلق معلومات فراہم کیں، غزل کی تعریف موضوعات وخصوصیات اور غزل کی نشو ونما غالب کی زندگی کے حالات غالب کے فارسی واردو ادبی کارنامے اور ساتھ ہی غالب کی شاعری کے بارے میں واقف کرایا۔ اغراض ومقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے اور آپ نے مطالعہ کیا، غالب کی زندگی میں کتنی مشکلات آئیں کیسے سامنا کیا اور انکی شاعری کس پائے کی ہے، ان کے نظریئے اور افکار کیا ہیں، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی، آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا، امید ہے کہ آپ ان سے مستفید ہوں گے۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔غزل کی تعریف کیجئے اور اسکی خصوصیات پر روشنی ڈالیئے۔

۲۔اردو میں غزل کے ارتقا پر اظہار خیال کیجئے۔

۳۔غالب کی زندگی کے حالات کا جائزہ لیجئے۔

۴۔غالب کے کلام کی اہم خصوصیات کا احاطہ کیجئے۔

۵۔غالب کی غزل کی فنی خوبیوں کی صراحت کیجئے۔

1.9 فرہنگ :

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اصطلاح	کسی لفظ کے عام معنوں سے ہٹ کر کوئی خاص مفہوم مقرر کر لینا	ہئیت	شکل وصورت
موزونیت	قرینہ	تناسب	مناسب
ثقیل	مشکل، کٹھن	اختصار	مختصر
ساخت	بناوٹ، ترکیب تعمیر	تکلّم	بات چیت، گفتگو
جدت	نیاپن	انفرادیت	منفرد، یگانہ
قوت ارادی	ارادے کا مضبوط ہونا، مصمم ارادہ رکھنا		
وصل	ملاپ	گردش ایام	دنوں کی گردش
عدو	دشمن	نیز	بھی
تنوع	رنگ برنگ، قسم قسم کا	وسیع	کشادہ
سلاست	روانی، کلام میں ثقیل لفظ نہ آنا	صنائع	بناوٹ

کارآمد	مفید	اختراع	اپنی طرف سے ایجاد کرنا
جوروستم	ظلم، ستم، زیادتی	سعی، پیھم	مسلسل کوشش
عشوہ	نازواداکرشمہ	فراق	جدائی،

ریزہ کاری خوشہ چینی، یا عمارت پر باریک اور نفیس نقش ونا گار بنانا۔

رعایت مناسبت

1.10 سفارشی کتب :

ا۔محاسن کلام غالب	ڈاکٹرعبدالرحمٰن بجنوری
۲۔غالب شخصیت اورشاعری	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۔نئے تنقیدی زاویے	ڈاکٹرخوشحال زیدی
۴۔اردوغزل	یوسف حسین خان
۵۔پیغمبران سخن (میرؔ، غالبؔ، کبیرؔ)	علی سردار جعفری
۶۔حیات غالب	شیخ محمد اکرام
۷۔غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری
۸۔غالب	مولانا غلام رسول مہرؔ
۹۔غزل اور درس غزل	اختر انصاری
۱۰۔غالب صدی میگزین (مرتب)	پروفیسر ڈاکٹرنورالحسن ہاشمی

بلقیس بانو۔یم

چیر پرسن، شعبہء اردو،

کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، میسور

اکائی ۔۲ بلاک (۱)

۲۔ غالبؔ کی پانچ غزلیں اور تشریح

ساخت

2.0 اغراض ومقاصد

2.1 تمہید

2.2 غالب کی پانچ غزلیں اوران کی تشریح (۱تا۵)

غزل۱: نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا۔۔۔۔

2.2.1 غزل کی تشریح

2.3 غزل۲: جراحت تحفۂ الماس ارمغان۔۔۔۔۔

2.3.1 غزل کی تشریح

2.4 غزل کی۳: جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار۔۔۔

2.4.1 غزل کی تشریح

2.5 غزل۴: کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا۔۔۔

2.5.1 غزل کی تشریح

2.6 غزل۵: دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ جل گیا۔

2.6.1 غزل کی تشریح

2.7 خلاصہ

2.8 نمونہ امتحانہ سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 سفارشی کتب

2.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو مکمل کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دیوانِ غالب سے ردیف الف کی پانچ (۵) غزلیں اور ان کی تشریح کر سکیں۔

☆ نیز غالب کے نظریات اور افکار جان سکیں اور اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

2.1 تمہید :

اس اکائی میں دیوانِ غالب سے ردیف "الف" کی پہلی پانچ غزلیں لی گئی ہیں اور ہر غزل کے ہر شعر کی تشریح بھی دی جائے گی، اور غالب کے نظریئے اور زاویہ فکر بھی بین السطور میں جان سکیں گے۔ اور پڑھ سکیں گے، اور نیز غالب نے اپنے مختلف نظریات جذبات کس خوبی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھال لئے ہیں، اس کا بھی ضرور اندازہ ہوگا۔

2.2 غالب کی پانچ غزلیں اور ان کی تشریح :

غزل ا: نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا۔۔۔۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصور کا

کاوِ کاوِ سخت جانہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے — سینۂ شمشر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر بچھائے — مدّعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

2.2.1 غزل کی تشریح: شعر ا: نقشِ فریادی۔۔۔۔۔

شعر ا: نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا۔۔۔۔

یہ شعر غالب کے دیوان کا پہلی غزل کا پہلا شعر ہے، اس شعر کی تشریح غالب نے اپنے کسی خط

میں کی ہے لکھتے ہیں "ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، میں نے یہ ذکر نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ کاغذی پیرہن پہن کر دادخواہی کے لئے جانا مشہور قدیم ایرانی رسم ہے"۔

بہر حال شعر کی تشریح کچھ یوں ہوسکتی ہے، یعنی اس شعر کے دو پہلو ہیں ایک ظاہر دوسرا باطن، شعر کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ دنیا میں کوئی بھی وجود ہو وہ رنج وغم میں مبتلا ہے، یہاں تک کہ تصویر بھی اپنی زبان سے یہ فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو وجود میں لا کر کیوں غم میں مبتلا کیا، جیسا کہ یہ کاغذی پیرہن (لباس) سے ظاہر ہو رہا ہے، شعر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز فریادی بنی ہوئی ہے، خدا سے شکایت کر رہی کہ اے خداوند تو نے ہمیں پیدا کرنے میں کس کس طریقے سے اپنی حکمتوں کو ہم پر آزمایا ہوگا۔ ہر شئے کو فنا ہونا تھا، تو اس قدر بنانے میں اہتمام کیوں کیا گیا، اس شوخیٔ تحریر کا کیا مطلب ہے، اگر غور کیا جائے تو غالب کے سوال کا جواب بھی شعر ہی میں موجود ہے، یعنی شوخیٔ تحریر کی ترکیب اس مفہوم کو نہ صرف مزید واضح کر رہی ہے بلکہ اس کے معنی میں بھی اضافہ کا باعث ہوئی ہے، تحریر کی شوخی خالقِ کائنات یا مصور کائنات کے مقصد تخلیق پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے، یعنے ہزار فانی ہونے کے باوجود یہ کائنات اپنے اندر ایک ایسا مقصد رکھتی ہے جس کے باعث اس کا ہر ذرہ فریادی بنا ہوا ہے، اور پکار پکار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے، خالق کائنات کو نہیں اس کے اس ارضی خلیفہ کو جو غافل ہونے پر آتا ہے تو بڑی بڑی حقیقت کو ایک چٹکی میں اڑا دیتا ہے، مطلب یہ کہ آدمی کو کائنات کی ناپائیداری اور بے ثباتی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آدمی کی عرصہ ٔحیات اتنی سی ہے، یہ کائنات ناپائیدار ہونے کے باوجود بے شمار معانی سے لبریز ہے، اور بلاشبہ غالب کے انداز خاص کا شعر ہے۔

شعر۲: کاوِ کاوِ سخت۔۔۔۔۔:

شاعر کہتا ہے کہ تلاش وجستجو کے باوجود بھی ہماری سخت جاں پر کیا گذرتی ہے یہ نہ پوچھو تو ہی اچھا ہے، یہ تو ایسے ہی ناممکن سی بات ہے جیسے کوئی صبح وشام کے درمیان دودھ کی نہر کھودے یا دوسرے لفظوں میں شاعر محبوب کی جدائی میں تڑپ رہا ہے، اور فراق وہجر کی مصیبتوں کا سامنا کر رہا ہے، یہ جدائی کی گھڑی اکیلے نہیں گذاری جا رہی ہے، اور وہ وصل کے لئے صبح کا انتظار کر رہا ہے، لہٰذا شاعر نے جدائی کی گھڑیوں کو سخت جان اور جوئے شیر کو صبح کی اجلی کرنوں سے تعبیر کیا ہے، جس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوا اور شاعر نے خوبصورتی سے تلمیح کا استعمال بھی کر لیا ہے۔

شعر۳: جذبہء بے اختیار شوق۔۔۔۔

شاعر کہہ رہا ہے کہ میرے بے اختیار نکلنے والے جذبوں کی اور کیا حقیقت ہو سکتی ہے، جو سینہء شمشیر سے نکلی دھار کی مانند ہے، یعنے میرے سچے اور حقیقی جذبوں کی قدر تو بس یہ ہے کہ کوئی اشتیاق سے جذبوں کی کشش لئے دیکھے تو پتہ چلے کہ تلوار کے سینے سے اسکا دم باہر نکل آیا ہے، یعنے اپنے محبوب کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو چکی ہے، اور جذبوں کی کشش یہ کہ اس کی تیاری دیکھ کر مجھے بے اختیار نکلنا پڑا، اے محبوب! تو میرے ان بے اختیار نکلنے والے جذبوں کو دیکھ کہ مجھے تیرا کس قدر خیال رہتا ہے، یہ جذبہء یہ کشش، یقینی طور پر محبوب کے شہید ہونے کی دلیل ہے۔

شعر۴: آگہی دام شنیدن۔۔۔۔

ہم اپنی عقل اور اپنے شعور سے جس قدر سمجھنا چاہیں سب بیکار ہے، وہ ہمارے مطلب کو نہیں پہنچ سکتی، یعنے جب ہم اپنی آگہی و عرفان کے ذریعے اس دنیا کو سمجھنا چاہیں یا اس دنیا کی حقیقت تک پہنچنا چاہیں تو ہمارے اشعار یا ہماری آرزوئیں یا ہمارے مطلوب مقصود سب بیکار ہیں، وہ زمانے کے حوادث کا شکار ہو گئے ہیں، ہم حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، اس کو سمجھنا ہماری گرفت سے باہر ہے، یہ سب کچھ اسرار و رموز کے پردوں میں چھپے ہوتے ہیں، اور وہ عقل و شعور کے چکّر میں نہیں پڑتے بلکہ ان کی تفہیم ذرا مشکل اور محال ہے۔

شعر۵: بس کہ ہوں غالبؔ اسیری۔۔۔۔

یہ شعر غزل کا مقطع ہے جس میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے، یہاں شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہے کہتا ہے کہ اے غالب! میں اسیری کی بندشوں میں یعنے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں پھر بھی میں بے قرار و بے تاب ہوں، ایسے ہی جیسے موئے آتش دیدہ ہے یعنی شاعر نے اپنے آپ کو زنجیروں میں اس قدر جکڑا ہوا پایا ہے اور محسوس کر رہا ہے جیسے کہ بال کو آگ دکھائی جائے تو وہ بل کھاتا ہے اور اس بل کھانے کو شاعر نے حلقہء زنجیر سے تعبیر کیا ہے، جنونِ عشق اور گرمئ عشق کی بیقراریوں کو قید و بند کی زنجیروں میں جکڑ کر معشوق کی بے تابیوں کا امتحان لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر عاشق کو پابہ زنجیر کر دو گے تو جذبہء عشق فنا نہیں ہوتا اور بڑھ جاتا ہے۔ فارسی الفاظ شاعر اپنے اشعار میں خوب استعمال کرتا ہے اور کمالِ خاص غالب ہی سے مختص ہے۔

2.3 غزل ۲ : جراحت تحفہء الماس ار مغاں....

جراحت تحفہء الماس ارمغان داغِ جگر ہدیہ
مبارک باشد اسد غمخوار جانِ درد مند آیا

2.3.1 غزل کی تشریح :

شعرا: جراحت تحفہ الماس۔۔۔۔۔۔۔۔

اس غزل کا صرف ایک شعر ہے اور شاعر خود سے مخاطب ہے یہاں اپنا تخلص اسدؔ استعمال کرتا ہے

شرح شعر یہ ہے کہ شاعر نے عشق کے بنیادی تصور کو یہاں پیش کیا ہے اور اس کے انسان میں پائے جانے سے سوائے نقصاں کہ یعنے بلائے جان کے اور کچھ نہیں ہے، مطلب یہ کہ معشوق کو محبوب نے عشق کے سوغات کے طور پر جراحت (زخم) الماس (ہیرا) جگر کے داغ دیئے ہیں، جس سے محبوب کی محبت میں شدت کا احساس پایا گیا ہے، اور جب محبوب نے معشوق کی گلی میں (یعنی کوچہ میں) قدم رکھا تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خونِ جگر زخم جگر، داغ جگر درد وغم یہ سب ہدیہ ہیں اور اس کے علاوہ اس کا کچھ بھی ماحصل نہیں ہے۔

2.4 غزل ۳ : جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار....

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیء چشم حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بو د تھا
ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشہء بغیر مرنہ سکا کو ہکن اسدؔ — سرگشتہء خمار رسوم و قیود تھا

2.4.1 غزل کی تشریح :

شعرا: جز تیں اور کوئی۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ شہرت و ناموری اور خوش قسمتی اتفاقات پر مبنی ہیں، اور تنگ نظری (یعنے چشم حسود) وسیع النظری (یعنے صحرا کی وسعت و کشادگی) سے مماثلت کرنے کی کوشش کی ہے، ان دونوں کے درمیان بہ، اور مگر سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں، مطلب یہ کے صحرا نورد قیس تھا، عشق و جنوں میں اس کے ہم پلہ کوئی اور ہے اور نہ ہی اس کی شہرت کے اعتبار سے برابری کر سکتا ہے، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دنیائے عاشقی بھی چشم حاسد کی طرح تنگ نظر ہو گئی ہے جسے دوسروں کی شہرت و نیک نامی پر جلن ہوتی ہے، جبکہ صحرا بہت وسیع و کشادہ ہے، مگر پھر بھی شاعر کو یہ چشم حاسد (تنگ نظر) لگتا ہے، اس شعر میں شاعرانہ تخئیل کے علاوہ کوئی انوکھی بات نظر نہیں آتی۔

شعر:۲: آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست۔۔۔۔

آشفتگی بمنی آشفتہ حال کنایۃ ہے، اور دود یعنے دھواں اس لحاظ سے شاعر نے آشفتگی کو دود سے اور سویدا کو داغ سے تعبیر کیا ہے، کہتا ہے کہ سویدائے دل سے اکثر دھواں اٹھتا ہے، اسکا سرمایہ جو کچھ بھی ہے وہ یہی دھواں (دود) ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نقشِ سویدا صرف آشفتگی سے پیدا ہوا ہے، اور یہ داغ جس کا سرمایہ و ماحصل دھواں (دود) ہے، وہ محبوب کے دل کی "آہ' ہے اسی لئے یہاں صرف دود کا گذر ہے، یعنے یہ سویدا ہماری آشفتگی سے پیدا ہوا ہے، اور دل سے نکلی آہ کا موجب بھی ہے۔

شعر۳: تھا خواب میں خیال کو۔۔۔۔۔

"سود" و "زیاں" کی ترکیب سے شاعر نے خوبصورت انداز میں ایک طرف محبوب کے وصل و ہجر کی بات چھیڑی ہے، تو دوسری طرف دنیا کی بے ثباتی ظاہر کی ہے، کہتا ہے کہ دنیاوی زندگی ایک دھوکا ہے، ایک دکھاوا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص خواب دیکھ رہا ہے، اور اپنی غفلت اور نادانی سے فریب نظر کو حقیقت سمجھ رہا ہے اور اس بے ثباتی دنیا کو حاصل کرنے میں ساری زندگی گنوادی اور جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ سب سراب ہے، جس کے پیچھے اس نے اپنی تمام تر زندگی گذار دی۔

بالفاظ دیگر یہ کہ جب پلک سے پلک ملی تو اس نے دیکھا خوابِ غفلت میں اپنے محبوب کو اس عالم میں لطفِ وصال اور صدمہء ہجر بھی اٹھایا، مگر جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں تھا وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا، اور اس سے اس کا نہ تو فائدہ ہوا اور نہ ہی نقصان یہ سب دھوکا تھا۔

شعر۴: لیتا ہوں مکتب غم دل میں۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ میں ابھی تک مکتبِ غم دل میں مبتلا ہوں اور ابھی تک میرا درس یہی رہا ہے کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا، مطلب یہ کہ محبوب سے دل لگانے سے پہلے مرا دل میرے اختیار میں تھا، مگر مبتلائے عشق میں میرے دل پر بھی اب میرا اختیار نہ رہا یہ بھی میرے قابو میں نہیں ہے، کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ دل بھی کبھی عیش و فراغت سے تھا اور اب دل بھی گیا عشق بھی گیا، یعنے نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔

شعر۵: ڈھانپا کفن نے داغ عیوبِ برہنگی۔۔۔۔۔

لفظ "برہنگی" کنایہ ہے، گناہوں کی کثرت کی طرف اشارہ کیا ہے جو انسان کے لئے باعثِ شرم اور ننگِ وجود ہوتا ہے، شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی تمام تر عمر گناہوں میں بسر کی تقویٰ میری طبعیت میں نہ رہا۔ اور اس وجہ سے میں ننگ وجود ہو گیا، یعنے ہر موقعہ اور ہر حال میں انسانیت کے لئے باعث ننگ (یعنی شرم) رہا، مگر یہ کیفیت اس وقت دور ہوئی جب میری موت ہوئی تو کفن سے مرے وجود کو ڈھک دیا گیا، جس سے میرا کفن میرے گناہوں کا پردہ پوش بن گیا۔

شعر۶: تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ شاعر نے فرہاد پر طعن کسا ہے کہتا ہے کہ فرہادؔ نے اپنے پیر پر آپ کلہاڑی مار لی ہے، اگر وہ اپنی منزل مقصود کو پانے میں کامیاب ہوتا تو ایسا نہ کرتا، اس نے عارضی سہاروں سے اپنے مقصد کو پانے کی کوشش کی جو ناکام رہا اور وہ پائے تکمیل تک نہیں پہنچ پایا۔ جس سے اس کا مقصد پائیدار نہیں رہا، بلکہ اس میں ناپائیداری نے جگہ بنالی تھی، یعنے وہ عشق میں کامل نہ تھا، اسی لئے اس نے اپنی موت کے لئے عارضی سہارا لیا۔ اور اگر وہ کامل ہوتا تو تیشہء کے بغیر ایک "آہ سرد" کھینچ کر ہی مر جاتا۔

2.5 غزل ٤ : کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا۔۔۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے؟ ہم نے مدّعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوستدار، دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بار ہا ڈھونڈھا تم نے بار ہا پایا

شورِ پندناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے "تم نے کیا مزا پایا؟"

2.5.1 غزل کی تشریح :

شعرا: کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر کا شوخی و مستی بھرا انداز ہے، محبوب اپنے معشوق سے کہتا ہے اگر تمہارا دل ہمیں کہیں پڑا مل گیا تو ہم تمہیں نہیں دیں گے، اس کے جواب میں وہ کہتا ہے میرے پاس دل ہے کہاں جو اسے کہیں اور ڈالوں، دل تو تمہارے ہی پاس ہے کھونے اور پانے کا سوال ہی نہیں۔

شعر۲: عشق سے طبیعت نے زیست۔۔۔۔۔

شاعر نے اس شعر میں درد کی دوا اور درد بے دوا سے لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، خود ہی بیمار اور خود ہی معالج بنا ہے، کہتا ہے کہ عشق کے بغیر زندگی بے معنی اور بے مزا ہے، بے لطف ہے، اگر عشق نہ ہو تو زندگی ایک درد ہے، عشق ہی دردِ زندگی کی دوا ہے، اور ایسی دوا ہے جو خود درد بے دوا ہے، مطلب یہ کہ عشق کی بدولت انسان تمام بیماریوں سے بلکہ برائیوں سے بری ہو جاتا ہے، یا یہ سمجھو کہ عشق انسان کو تمام دکھ اور غم سے نجات ہی نہیں بلکہ تمام عیوب اور مسئلوں سے چھٹکارا بھی دیتا ہے۔

شعر۳: دوستدار دشمن ہے اعتماد۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ شاعر کو لگتا ہے کہ معشوق کی آہیں بے اثر ہیں، اور اس کے نالے گریہ

وزاری سب بے کار و بے اثر منزلِ مقصود تک انکی پہنچ نہیں ہے۔اس کی وجہ بس یہی ہوسکتی ہے کہ ہمارا دل رقیب کی خیر خواہی اور اس کی دلجوئی میں لگا ہوا ہے۔ اسلئے ہمیں اپنے دل پر بھروسہ نہیں رہا۔ مطلب یہ کہ ہمارا دل محبوب کا دوست اور خیر خواہ ہے، اسلئے ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے، اس کی وجہ اس کی آہ میں اثر ہے اور نہ اس کے نالے رسائی پا رہے ہیں۔

شعر۴: سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری۔۔۔۔۔۔

اس شعر میں حسینوں کی فطرت کا اظہار ہے یعنے اگر چہ حسینوں کی سادگی صرف دیکھنے کی ہے بظاہر تو وہ سیدھے سادے لگتے ہیں پر حقیقت میں وہ ایسے نہیں ہیں، ورنہ بباطن وہ بڑے شاطر، چالاک، اور عیار ہوتے ہیں، ان کی سادگی اور تغافل شعاری اپنے عشاق کی ہمت کا امتحان لینے اور جرأت آزمانے کے لئے ہوتی ہے۔

شعر۵: غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل۔۔۔۔۔۔

شاعر اس شعر میں دل کو غنچہ سے مشابہت دی ہے اور کہتا ہے کہ جب غنچہ کھلا تو اسے دیکھ کر ہمیں اپنا خوں گشتہ اور گم شدہ دل یاد آیا کہ اس کی شکل وصورت بھی ایسی ہی تھی اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ یہ ہمارا ہی دل ہے خوبصورت غنچہ کے مانند لگنے لگا۔

شعر۶: حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنے۔۔۔۔۔۔۔

ہمیں اپنے دل کا مدتوں سے کچھ حال معلوم نہیں ہے، بس اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی اس کی تلاش کی ہمیں تو نہ ملا لیکن تمہیں مل گیا، مطلب یہ کہ عاشق کا دل ہمیشہ معشوق کے پاس محفوظ ہوتا ہے، اسلئے تم نے ڈھونڈا اور پالیا۔

شعر۷: شورِ پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا۔۔۔

اس شعر میں شاعر نے " آپ " اور " تم " کے متکلم صیغوں سے بڑا لطف پیدا کیا ہے، اور واعظ و ناصح پر طنز بھی کیا ہے، کیونکہ اس سے عاشق کی فطرت ظاہر ہوتی ہے، لہٰذا اسے پند و نصیحت سے بہت کوفت ہوتی ہے، مطلب یہ کہ زخم پر نمک کا چھڑکنا اپنے آپ میں طنز کا پہلو لئے ہوئے ہے اور اسکا مزا پایا کہنا یعنی کیا فائدہ ہوا جس سے معشوق کی کوفت اور اذیت کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جوابات :

ذیل کے اشعار کی تشریح کیجئے:

۱۔نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ☆ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

۲۔تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ☆ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

۳۔حال دل نہیں معلوم، لیکن اسقدر یعنی ☆ ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

سوال:۱،۲،۳، کے لئے جواب 2.2.1، 2.4.1، 2.5.1 کے تحت دیکھئے:

2.6 غزل ۵ : دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ چل گیا۔۔۔۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ چل گیا — آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں، اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

2.6.1 تشریح :

شعر۱: دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ۔۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ آتشِ عشق جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہے وہ میرے دل کو بڑی بے دردی سے جلا کر راکھ کر رہی ہے، یہاں شاعر سوزِ نہاں استعمال کر کے عشق کی تپش کو ظاہر کر رہا ہے، اور اپنے محبوب کی بے التفاتی کو عیاں کر رہا ہے، یہ تپشِ عشق جو بے محابا، بے تامل، چپکے چپکے سے اندر ہی اندر جل رہی تھی، اس سے یہ ظاہر نہ ہو پایا کہ میرا دل کب جلا اور کب راکھ ہو گیا۔

شعر۲: دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک۔۔۔

اس شعر میں بھی شاعر تپش عشق کی گرمی کو بیان کر رہا ہے، کہ عشق کی آگ نے میرے دل کو اس قدر جلا کر بھسم کر دیا ہے کہ اب اس کا کوئی نشان باقی نہ رہا، حتیٰ کہ ذوقِ وصل کی طمع بھی اب باقی نہ رہی اور نہ ہی کوئی یادِ محبوب یعنے جو "تھا" کے اس ماضی کے صیغے سے شاعر کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ دل میں جو کچھ موجود تھا وہ سب جل گیا، آتش عشق کی یہ تباہ کاری ہے۔

شعر۳: میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ۔۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ میں عدم کی منزل سے آگے نکل گیا ہوں، اور میرا مقام عدم میں تھا تو وہاں میں نے "آہ آتشیں" کھینچی جس سے عنقا کے پر جل گئے، یہ تبھی ممکن ہے جب ذاتِ حقیقی سے دوری کا احساس اتنا شدید ہو کہ اس کے ماتحت منزل عدم میں بھی "آہ" کی جائے تو ہستی کی طرف رجعت کے تصور کو یکلخت فنا کر دے اسی کو شاعر نے "بالِ عنقا" کے جلنے سے استعارہ کیا ہے، عدم (موجود) آہ آتش (تپش عشق) عنقا (فرضی پرندہ) معدوم سے تپش عشق کی گہرائی و گرمی کو شاعر نے شدت سے محسوس کرنے کی کوشش کی ہے مطلب یہ ہے کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں کا ماحصل یہ ہے کہ میں نہ موجود ہوں نہ معدوم، اب نہ مجھ پر عدم کا حکم لگایا جاسکتا ہے، نہ وجود کا ہر قید و بند سے آزاد ہو گیا۔ بہ حیثیت مجموعی اس سے شاعر کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ پہلے میری آہوں میں بڑی تاثیر تھی اور "بالِ عنقا" بھی نہیں جلتا تھا، مگر وہ تاثیر اب باقی نہ رہی اس لئے میری ہستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ عدم سے بھی گذر گئی ہے، غالب کی پرواز تخیل کا کمال ہے کہ "عدم" کو "وجود" اور "معدوم" کو "موجود" میں تبدیل کر دیا ہے۔

شعر۴: عرض کیجئے جوہر انہ۔۔۔۔۔۔

میں اپنی طبیعت کی گرمی کا اظہار کہاں تک کروں میری طبیعت میں اس قدر گرمی ہے کہ میں محض وحشت صحرا کا خیال کروں تو اس میں بھی آگ لگ جاتی ہے، یعنے عشق نے میری طبیعت میں اس قدر گرمی پیدا کر دی ہے کہ اس کا اظہار ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحرانوردی کا خیال دل میں آنے سے صحرا جل گیا اگر صحرانوردی کرتا تو خدا معلوم کیا ہو جاتا ہے، یعنی سارا عالم جل کر خاک ہو جاتا۔

شعر۵: دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ دل تو جل گیا ہے صرف داغ باقی رہ گئے ہیں اگر وہ زندہ ہوتا تو تجھے ضرور یہ دلکش نظارہ دکھاتا ہے، چراغاں سے "خوشی" دکھاتا، سے دل کا آتش عشق میں جل جانا کا رفرما اور داغوں کی بہار (یعنی اس چراغاں) کا جو منتظم تھا جل گیا ورنہ وہ اگر زندہ ہوتا تو یہ نظارہ ضرور دیکھ پاتا۔

شعر ۶: میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل۔۔۔۔۔۔۔۔

یہاں شاعر نے دنیا کی بے ثباتی اور دنیا والوں کی منافقت پر افسردگی ظاہر کی ہے اور شاعر کی یہ افسردگی، اس کی طبیعت کی تاثیر بن گئی ہے، مطلب یہ کہ اے غالب! اب میں ہوں اور افسردگی کی آرزو ہے یعنی مجھے اب زندہ دلی کی تمنا نہیں ہے، اور اب یہ راست نہیں آتی کیونکہ میرا دل اہل دنیا کے ظاہری تپاک اور باطنی نفرت یعنی اہل دنیا کی منافقانہ روش سے جل کر خاک ہو گیا ہے۔

2.7 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپکو غالبؔ کے دیوان سے ردیف الف کی ابتدائی پانچ غزلیں (۱ تا ۵) اور ان کی تشریح کے بارے میں واقف کرایا، اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپکے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف غزلوں اور ان کی تشریح سے غالب کے افکار و خیالات کیا ہیں، اس اکائی سے قبل کی اکائی میں فن غزل گوئی اور غالب کی حیات و کارنامے اور ان کی شاعری سے متعلق جانکاری حاصل کی۔ یہ اکائی پچھلی اکائی کا تسلسل ہے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی اور آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا، توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ "نقش فریادی" اور "شوخی تحریر" سے شاعر کی کیا مراد ہے لکھئے؛

۲۔ "چشم حسود" سے شاعر کیا مراد لیتا ہے، اپنے الفاظ میں لکھئے؛

۳۔شعر "تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ☆ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا؛
میں "سود و زیاں" کی ترکیب پر غور کیجئے اور بتائیے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔
۴۔"درد کی دوا" اور "درد بے دوا" سے کیا مراد ہے؟
۵۔"میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا" کے ذریعہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔
۶۔درجِ ذیل اشعار کی تشریح کیجئے:
۱۔کاوِ کاوِ سخت جاں ہائے تنہائی نہ پوچھ☆ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
۲۔لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز☆ لیکن یہی کہ رفت " گیا" اور "بود" تھا
۳۔دل میں ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہیں☆ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
۴۔حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی☆ ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا۔

2.9 فرہنگ :

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
پیرہن	لباس	نقش	صورت، تصویر
شوخیٔ تحریر	دلکش تحریر	کاوکاو	کاوش، سعی پیہم
آگہی	عقل و فہم،	دام	جال پنجر،
	شعور عرفان	شنیدن	سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنا
مدعا	مطلب	آتش زیرپا	{بے چین بے قرار
عنقا	معدوم، نابود (ایک فرضی پرندہ کا نام)		پاؤں تلے آگ}
جراحت	زخم،	الماس	ہیرا
ارمغاں	تحفہ	بسکہ	چونکہ
بروئے کار نہ آنا	مقابلے میں نہ آنا	آشفتگی	پریشانی

نقش سویدا	دل پر ایک سیاہ تل		
دود	دھواں	سرگشتہ ءخمار	نشہ ءسے مدہوش
ننگ وجود	وجود ہستی کیلئے باعث شرم	دوستدار دشمن	رقیب کا خیر خواہ
موئے آتش دید	بال کو آگ دکھانا،	پرکاری	چالاکی
سادگی	بھولا پن،	بےخودی	بے پروائی
ہشیاری	خبرداری	بےتامل	بغیر سوچے سمجھے
تغافل	جان بوجھ کر غفلت برتنا	پند	نصیحت
سوز نہاں	سوز دل، آتش عشق	عدم	نیستی
جوہر اندیشہ	سوچنے کا جوہر	کارفرما	حاکم یعنی دل
چراغاں	روشن	محابا	لحاظ

2.10 سفارشی کتب :

ا۔دیوانِ غالب	غالبؔ
۲۔غالب اور بوطیقا (اشعار غالب کی تفہیم)	مشکور حسین آباد
۳۔شرح دیوان اردو غالب	سید علی حیدر نظم طباطبائی
۴۔شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی
۵۔مطالعہ غالبؔ	اثر لکھنوئی

بلقیس بانو۔یم۔

چیر پرسن، شعبہ ءاردو

کے یس او یو، میسور

اکائی ۔۳ بلاک ۱

غالبؔ کی پانچ غزلیں اور تشریح (٦ تا ١٠)

ساخت :

3.0 اغراض ومقاصد

3.1 تمہید

3.2 غالب کی پانچ غزلیں اور تشریح {چھے(٦) تا (١٠)دس}

غزل٦: شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا۔۔۔۔

3.2.1 غزل کی تشریح:

3.3 غزل ۷: دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا۔۔۔۔

3.3.1 غزل کی تشریح

3.4 غزل ۸: شمار سبحہ مرغوبِ بت مشکل پسند آیا۔۔۔۔

3.4.1 غزل کی تشریح

3.5 غزل ۹: دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا

3.5.1 غزل کی تشریح:

3.6 غزل ۱۰: ستائش گر ہے زاہد اس قدر باغِ رضواں کا۔۔۔

3.6.1 غزل کی تشریح

3.7 خلاصہ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.9 فرہنگ

3.10 سفارشی کتب

اس شعر میں شاعر عشق کے اندوہ غم کی شدت کو بیان کرتا ہے، یعنی اندوہ عشق سے کسی طرح چھٹکارہ نہیں مل سکتا، اگر دل سینہ میں موجود ہے تو اسکا ہونا بے چینی کا موجب ہے، اور اگر اسے سینہ سے نکال دیا جائے تو اسکا جانا بجائے خود موجب رنج والم ہے۔

شعر۶: احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ دوستوں نے میری وحشت کا ازالہ کرنے کے لئے مجھے محبوس کر دیا ہے تا کہ میرا جوش وجنوں نہ بڑھے، مگر قید سے چارہ سازئ وحشت نہ ہوسکی، کیونکہ میں نے تصور میں صحرا نوردی شروع کر دی۔ "جسم"، زنداں میں رہا تو کیا ہوا، "خیال" تو بیاباں نورد تھا، مگر اس سے عاشق کی وحشت کسی طرح دور نہیں ہوسکتی۔

شعر۷: یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے۔۔۔۔۔

شعر میں لفظ "آزاد مرد" کے استعمال سے اسدؔ خستہء جان میں جان پڑ گئی ہے، کیونکہ اسی کی رعایت سے لاش کو "بے کفن" کہا ہے، اور ارباب ذوق یہ بھی جانتے ہیں کہ اس لفظ "بے کفن" میں بے کسی و بے بسی کو باندھا ہے، مطلب یہ کہ عاشق صادق دینوی آلام سے بے نیاز ہوتا ہے اور اسے صرف اپنے محبوب حقیقی سے الفت ہوتی ہے، مطلب یہ کہ یہ "بے کفن" لاش اسدؔ خستہ کی جان ہے، خدا اس کی مغفرت کرے کہ وہ بھی ایک عجب "آزاد مرد" تھا، اس کی لاش بھی "بے کفن" پڑی ہے، وہ جب زندہ تھا سارے تکلفات سے آزاد تھا، اور مر کر بھی گور وکفن کی بندش سے آزاد ہے۔

3.4 غزل ۸: شمار سبحہء مرغوب بت مشکل پسند آیا۔۔۔۔۔۔

شمار سبحہء مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینہء بے مہرئ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدان بسمل پسند آیا

3.2.1 غزل کی تشریح :

شعر۱: شور ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ یہ شوق یا عشق ایسے واقع ہوا ہے، جیسے تصویر کے پردے میں قیسؔ کا عریاں نظر آنا یعنی شاعر نے یہاں عشق جنوں جذب و کیف کی ہر تصویر کو ناموس عشق کا رفیق بتانے کی بجائے رقیب تصور کیا ہے اور قیسؔ کی تصویر کا سہارا لیا ہے، یعنی یہ کہ قیسؔ کی ناکامیٔ محبت کی تصویر کشی کی ہے اور اسکی جذبۂ عشق کے پردے میں ہر رنگ عشق کو اسی کی تصویر میں ڈھونڈھتے کی کوشش کی ہے، مطلب یہ کہ محبوب ہر حال میں تکلفات اور ساز و سامان کا رقیب ہے یعنی بے نیاز ہوتا ہے، اور عاشق اپنے محبوب کے حصول میں اس قدر ڈوبا رہتا ہے، کہ اسے اپنے سر و پا کا اپنی آرائش زندگی کا کچھ ہوش و خیال نہیں رہتا اسلئے اس نکتۂ کو شاعر نے قیسؔ کی زندگی سے تعبیر کر کے بتایا ہے، کہ دیکھ لو مصور نے بھی اس کی تصویر بنائی ہے اسے عریاں ہی دکھایا یعنی عشق اس بے ثباتی دنیا سے عاشق کو (انسان کو) بے گانہ کر دیتا ہے۔

شعر۲: زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ اے خدا!! زخموں نے میرے رنجیدہ دل کی کوئی دادرسی نہیں کی یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی گھائل کے سینہ سے تیر نکالا جائے یعنی شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ میرا دل چھوٹا ہے، لیکن اس پر لگے زخم بڑے گہرے ہیں، زخم لگنے کا سبب تو یہ ہے کہ یہ میری ہی تنگیٔ دل کی وجہ سے لگے، تیر نے میرے ساتھ یہی اصول اپنایا اور میرے سینۂ بسمل سے یہ پرافشاں نکلا اور میرے دل سے تعلقات توڑ لئے، سینۂ بسمل سے تیر پرافشاں نکلنا اور تنگی دل کے زخموں کا داد نہ دینا عاشق کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے، اس کو رنج و غم میں مبتلا کر دیتا ہے، وہ تو محبوب کی بے التفاتی کے باعث پہلے ہی رنجور ہے، اور اگر اس کے زخموں کی مرہم پٹی نہ کی جائے تو وہ اور بڑھ جاتے ہیں، یہ اس کے لئے نقصان دہ نہیں تو اور کیا ہے، اسلئے شاعر نے اس کے زخموں کی دادرسی کی خواہش ظاہر کی ہے۔

شعر۳: بوئے گل، نالۂ دل دود چراغ محفل۔۔۔۔

، نالہء دل، دودِ چراغ محفل میں شاعر کو پریشانی نظر آتی ہے، اور محبوب پر الزام دھرتا ہے کہ تیری بے نیازی کی وجہ سے یہ سب تیری محفل سے پریشان نکلتے ہیں۔ شاعر ان پر نگاہ رشک ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ انکی پریشانی کا سبب تیری بے دادرسی اور بے نیازی ہے اور یہ تجھ پر نثار ہونا چاہتے ہیں، مگر تیری بے نیازی دیکھ کر تیری بزم سے پریشان نکل رہے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تینوں فنا کی طرف گامزن ہیں یعنی گل اپنی خوشبو چمن میں بکھیر کر مرجھا جاتا ہے، دل اپنی آہ وزاری کے بعد چپ ہو جاتا ہے، اور چراغ کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے، اس دنیا میں جو بھی چیز ہے، وہ فنا ہوتی ہے، اور باقی رہنے والی خدا کی واحد ذات ہے، اور شاید شاعر نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شعر۴: دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذتِ درد۔۔۔۔

میرے حسرت زدہ دل کے دسترخوان پر لذتِ درد کے کھانے چنے ہوئے تھے، میرے دوستوں نے اپنے اپنے لب ودندان کی قوت کے مطابق میرے دسترخوانِ درد سے درد کا ذائقہ چکھ لیا، گویا یاروں نے اپنی ضرورت کے مطابق میرے ارماں بھرے دسترخوان سے لذت درد کا ذائقہ لیا اس شعر کی معنوی خوبی تو یہ ہے کہ دل حسرتوں کی آماجگاہ ہے، ناکام و نامراد حسرتوں سے دل کا دسترخوان چنا ہوا ہے، جس پر لذت درد کے مختلف اقسام ہیں، عاشق نہ اپنی حسرتوں کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور نہ اس کی حسرتیں ختم ہونے پاتی ہیں، لہٰذا دسترخوان لذت درد سے وسیع وعریض ہو جاتا ہے، شاعر کو اور اس کے یار دوستوں کو اس دسترخواں سے درد وغم سے لطف اندوز ہونے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے، شعر کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عشق کی انتہا خواہش وجذبے کے پورے ہونے میں نہیں بلکہ ترک خواہش وترک تمنا میں ہے۔

شعر۵: ہے نوآموز فنا ہمت دشوار پسند۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ اے مشکلات میں گھری ہوئی ہمت تو نے ابتدائی مرحلوں ہی میں اس دشوار گذار منزل کو آسانی سے طے کرلیا تیری ہمت اور تیرے ارادوں کی داد دینی چاہیےء اگر تو نے ان کٹھن منزلوں کو اس قدر اتنی آسانی سے طے کرلیا ہے تو تیرے لئے کوئی بھی مشکل ودشوار کام بڑا آسان

ہوگا۔ یہ جان کر ہمیں بڑا دکھ ہوا اور یہ سوچ رہے ہیں کہ تیرے لئے کونسا مشکل اور کٹھن کام دیں جس کو طے کرنے میں تجھے دشواری ہو تیرے لئے فنا کو ہم نے چنا تھا اور سوچا تھا کہ فنا تیرے لئے مشکل اور کٹھن منزل ہوگی لیکن اب میرے لئے مشکل یہ آن پڑی کہ اپنی ہمت دشوار پسند کی تسکین کے لئے کون سا مرحلہ تلاش کروں مقام فنا کا حصول تو بہت آسان نکلا اور اس سے بالاتر کوئی مقام نہیں ہے۔

شعر۶: دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ ۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ اے غالب! ہمارے دل نے پھر اس قدر آہ و بکا کی ہے کہ ایک شور، ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا ہے، افسوس کہ اس سے ایک قطرہ نکلنے کی امید نہ تھی وہ اب طوفان کی طرح چھا رہا ہے، یعنی اے غالب! غموں کا ایک طوفاں دل کے سمندر میں موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے، پہلے تو میں نے بڑے ضبط سے کام لیا تھا اور اپنے جذبوں کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی تھی دل پر بڑے بڑے حادثوں کو چپ چاپ سہہ لیا۔ کسی بھی طریقہ سے ظاہر ہونے نہیں دیا، اور دل پر بڑا جبر کیا تھا، اس وقت آنکھ سے ایک قطرہ بھی نہ نکلا تھا، لیکن اب شاید میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا ہے، اور جذبات کے دھارے بہنے کو ہیں، اور یہ جذبے ایک طوفانی صورت اختیار کر گئے ہیں، اور یہ اب میرے قابو سے باہر ہو گئے ہیں، اس شعر میں شاعر کی جوش گریہ کی شدت ہے اور شاعرانہ بیان کا لطیف پہلو۔

3.3 غزل ۷: دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا ۔۔۔۔

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوہء گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

3.3.1 غزل کی تشریح :

شعر۱: دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا۔۔۔۔۔

جو شخص محبت میں سچا اور صادق نہیں ہوتا وہ عشق کی سختیاں نہیں جھیل سکتا محض ایک ہی دھمکی اس پر کارگر ہو جاتی ہے، وہ آغاز مصائب ہی میں اس کوچہء کو ترک کر دیتا ہے، (یعنی ایک ہی دھمکی میں مر جاتا ہے) عشق چونکہ بہادر ہے، شجیع ہے، اسلئے وہ بہادروں کو (یعنی سچے عشاق) پسند کرتا ہے، عشق اسی کو زیب دیتا ہے جو ہر کٹھن منزل کو بہ آسانی اور بہ خوشی طے کر دے، یہ اسی کے لئے سزاوار ہے، جو ان مصائب کو برداشت کر سکے۔

شعر۲: تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا۔۔۔۔۔

اس شعر میں تلقین درس فنا کی طرف اشارہ ہے، شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں جنہیں موت کا ہمیشہ احساس رہتا ہے، ان پر ہمیشہ مردنی چھائی رہتی ہے، ان کا رنگ مرنے سے پہلے ہی زرد ہوتا ہے، یعنی اس نے زندگی ہی میں اپنے اوپر فنا کا رنگ طاری کر لیا تھا۔

شعر۳: تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں۔۔۔۔۔شاعر کہتا ہے کہ میں ابھی ابتدائے عشق میں ہوں اور عہد طفلی ہی سے وفا شعار بھی ہوں، جس زمانے میں میرے خیالات غیر مربوط تھے اور میری عقل خام و بیکار تھی، اس وقت بھی وفا شعاری پر کتابیں لکھ رہا تھا، یعنی عشق میں مبتدی ہونے کے باوجود بھی مجھ میں وفا شعاری تھی۔

شعر۴: دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب۔۔۔۔۔

اگر چہ اس وقت یہ حالت ہے کہ دل سے لے کر جگر تک تمام سینہ میں خون کا دریا بہہ رہا ہے، مگر کبھی یہ رہ گذر اس وقت دلکش تھی کہ ان کے سامنے جلوہء گل بھی ہیچ و بیکار تھے، یعنی جفائے محبوب سے پہلے بھی شگفتہ مزاج تھے، شاعر کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ عشق انسان کو موردِ آلام بنا دیتا ہے۔

شعر۵: جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر عشق کے اندوہ غم کی شدت کو بیان کرتا ہے، یعنی اندوہ عشق سے کسی طرح چھٹکارہ نہیں مل سکتا، اگر دل سینہ میں موجود ہے تو اسکا ہونا بے چینی کا موجب ہے، اور اگر اسے سینہ سے نکال دیا جائے تو اسکا جانا بجائے خود موجب رنج والم ہے۔

شعر۶: احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ دوستوں نے میری وحشت کا ازالہ کرنے کے لئے مجھے محبوس کر دیا ہے تا کہ میرا جوش وجنوں نہ بڑھے، مگر قید سے چارہ سازئ وحشت نہ ہوسکی، کیونکہ میں نے تصور میں صحرا نوردی شروع کر دی۔ "جسم"، زنداں میں رہا تو کیا ہوا، "خیال" تو بیاباں نورد تھا، مگر اس سے عاشق کی وحشت کسی طرح دور نہیں ہوسکتی۔

شعر۷: یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے۔۔۔۔۔

شعر میں لفظ "آزاد مرد" کے استعمال سے اسدؔ خستہء جان میں جان پڑ گئی ہے، کیونکہ اسی کی رعایت سے لاش کو "بے کفن" کہا ہے، اور ارباب ذوق یہ بھی جانتے ہیں کہ اس لفظ "بے کفن" میں بے کسی و بے بسی کو باندھا ہے، مطلب یہ کہ عاشق صادق دینوی آلام سے بے نیاز ہوتا ہے اور اسے صرف اپنے محبوب حقیقی سے الفت ہوتی ہے، مطلب یہ کہ یہ "بے کفن" لاش اسدؔ خستہ کی جان ہے، خدا اس کی مغفرت کرے کہ وہ بھی ایک عجب "آزاد مرد" تھا، اس کی لاش بھی "بے کفن" پڑی ہے، وہ جب زندہ تھا سارے تکلفات سے آزاد تھا، اور مر کر بھی گور وکفن کی بندش سے آزاد ہے۔

3.4 غزل ۸: شمار سبحہء مرغوب بت مشکل پسند آیا۔۔۔۔۔۔

شمار سبحہء مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینہء بے مہرئی قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدان بسمل پسند آیا

3.4.1 غزل کی تشریح:

شعر ۱: شمار سبحہ ءمرغوب بت مشکل پسند آیا۔۔۔۔۔

شاعر اپنے محبوب کی پسند ظاہر کر رہا ہے کہ ہمارا محبوب اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنا جلوہ دکھائے تو سینکڑوں معشوق کے دل بیک وقت مٹھی میں آسکتے ہیں، یعنی تسبیح پھراتے (یعنی پڑھتے) وقت سارے دانے قبضہ میں آجاتے ہیں، اس لئے محبوب کو شمار سبحہ (مالا پھیرنا) پسند ہے اور یہ صورت حال محض ایسی ہے جیسے کہ شمار دانہ ہائے تسبیح کو بیک کف بردن صد دل سے مشابہ کیا ہے۔

شعر ۲: یہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے۔۔۔۔۔

پے در پے ناکامیوں اور محرومیوں سے شاعر بیدل اور بددل ہو گیا ہے، اسی کی بدولت وہ دائمی طور پر ناامید ہو گیا ہے اور یہ ناامیدی اس کے لئے معمولی سی بات ہے، اور جب کشائش، (بمعنی کشودگی) کی صورت پیدا ہو تو عقدہ ءمشکل کی کشود ممکن ہوسکتی ہے، مگر ہماری بے دلی سے خود کشائش کو ہمارا عقدہ ءمشکل پسند آگیا ہے، یعنی وہ چاہے کہ ہم کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اس یقین کے بدولت ہمیں ایک گونہ اطمینان اور سکونِ دل حاصل ہو گیا ہے، یعنی نومیدء جاوید (ناامیدی یعنی سکونِ دل مراد لیا ہے) جس پر عام حالات میں راضی ہونا مشکل ہے، ہمارے لئے آسان ہوگئی ہے۔

شعر ۳: ہوائے سیر گل آئینہ ءبے مہری قاتل۔۔۔۔۔۔

شاعر یہاں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محبوب کی بے مہری سرگل کی آرزو کا سبب ہے اور دوسری طرف کہتا ہے کہ پھولوں میں عاشق کے خون میں غلطاں ہونے کا اندازہ پایا جاتا ہے، اور محبوب کو یہ نظارہ بہت بھاتا ہے، شاعر اس شعر کے ذریعے محبوب کی جفاکشی کو پسند کرتا ہے۔

3.5 غزل ۹ ہ : دھر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ھوا -----

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ۔۔۔ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہء معنی نہ ہوا

سبزہء خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا ۔۔۔ یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفا سے چھوٹوں ۔۔۔ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزر گاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ۔۔۔ گر نفس جادہء سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی ۔۔۔ گوش منّت کش گلبانگ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیء قسمت کی شکایت کیجئے ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سووہ بھی نہ ہوا
مرگیا صدمہء یک جنبشِ لب سے غالبؔ ۔۔۔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰؑ نہ ہوا

3.5.1 غزل کی تشریح :

شعر ۱: دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا۔۔۔۔۔

دنیا میں لفظ "وفا" استعمال تو کیا جاتا ہے، لیکن کبھی اصل معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ اس بے معنی استعمال اور خالی ذکر وفا سے عاشق صادق کی تسلی نہیں ہوسکتی۔ اسلئے یہ وہ لفظ ہے کہ جس کو کبھی اپنے معانی کا شرمندہء احسان نہ ہونا پڑا۔ شاعر یہاں شکوہء، ناقدریء وفا کا ذکر کررہا ہے، کہ افسوس اس دنیا میں کوئی بھی وفا کا قدرداں نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری وفا شعاری میرے لئے وجہ تسلی نہ ہوسکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا والوں کی نظر میں یہ لفظ بے معنی سا ہے، شاعر کا مقصود یہ ہے کہ جب دنیا میں اصلی وفا نہیں تو وہ صرف نقش وفا سے تسلیِ خاطر کیونکر ہوسکتی ہے۔ غالبؔ کے انداز بیان کی یہ خوبی ہے کہ کسی کو الزام نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ شاید لفظ وفا بے معنی ہے کوئی سمجھتا ہی نہیں قدر کیا کرے۔

شعر ۲: سبزہء خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا۔۔۔۔۔

کہتے ہیں کہ زمرد کو دیکھ کر سانپ اندھا ہو جاتا ہے، یعنی پھر وہ کسی کو ایذا نہیں پہنچا سکتا، لیکن تعجب کی بات ہے کہ تیرا سبزہء خط (جو مثل زمرد ہے) تیری کاکل کا (جو مانند افعی ہے) کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کرسکا یعنی اسے مغلوب نہ کرسکا، مطلب یہ کہ آغاز سبزہء خط کے باوجود، زلف جاناں کی دلفریبی و دلکشی میں کوئی امتیاز و فرق نہ آیا۔

شعر ۳: میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ جفا سے چھوٹوں۔۔۔۔۔

مصائب عشق سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے مرنے کی تمنا کی، مرجانے کا ارادہ کیا، مگر افسوس کہ میرے محبوب نے مجھے مرجانے کے اس ارادے سے دور رکھا۔ اور چونکہ میں وفا شعار ہوں اس لئے اس کی خاطر سے یہ ستم بھی گوارا کرلیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں اندوہ وفا میں گرفتار ہوگیا، اور اسکی بے وفائی کے صدمے میں جھیل رہا ہوں۔

شعر۴: دل گزرگاہ خیال مے وساغر ہی سہی۔۔۔۔۔

اس شعر میں طرز ادا کی جدت اور اندازِ بیان میں شوخی بڑی خوبصورت ہے شاعر کہتا ہے کہ انسان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے اگر متقی نہ بن سکا نہ سہی رند تو بن ہی جائے۔ مطلب یہ کہ تقویٰ سے مقصود یہ ہے کہ انسان ہر وقت مسرور وشادمان رہتا ہے، چونکہ مجھے یہ کیفیت مے نوشی کے تصور سے حاصل ہے، اسلئے اگر میری طبیعت تقویٰ کی طرف مائل نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ میرے دل میں مئے نوشی کی آرزو تو ہر وقت موجزن رہتی ہے۔

شعر۵: ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر غیرت مند عاشق کی طرح محبوب کا احسان لینا گوارا نہیں کرتا، اور اس لحاظ سے شعر میں شعری جدت پیدا کرنے کی خوبصورت کوشش ملتی ہے۔ کہتا ہے کہ اے محبوب! اگر تو نے مجھ سے وعدہ وصل نہیں کیا تو اسی میں بھی خوشی کا پہلو چھپا ہوا ہے، کیونکہ میرے کان تیری تسلی بخش آواز کے احساس مند ہونے سے محفوظ رہے کیونکہ ایک عاشق صادق کبھی محبوب کا احسان گوارا نہیں کرتا۔

شعر۶: کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے۔۔۔۔۔

شاعر محرومیٔ قسمت کا گلہ کر رہا ہے کہتا ہے کہ ہم اس قدر بدنصیب ومحروم ہیں کہ تنگ آ کر مرنے کی آرزو وتمنا کر رہے ہیں، مگر وہ بھی پوری نہیں ہو رہی ہے، مگر موت تو ایک ایسی چیز ہے جو کہ بغیر آرزو وتمنا کے بھی میسر آجاتی ہے۔

شعر۷: مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر اپنی ناتوانی وضعف کی شدت کا احساس کر رہا ہے، کہتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے مجھے صحت عطا کرنے کے لئے اپنے لبوں کو جنبش دی یعنی حرکت دی تو میں اپنی ناتوانی کے باعث انکی حرکت کی تاب نہ لا سکا، اور قبل ازیں کہ وہ مجھ پر کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونکتے میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا، شاعر نے اپنی ناتوانی میں شوخی کا پہلو یوں لایا ہے کہ دمِ عیسیٰ کو اپنی موت کا سبب ٹھہرایا۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جوابات :

۱۔ بوئے گل "نالہء دل" اور دودِ چراغ محفل سے شاعر کی کیا مراد ہے بیان کیجئے۔

۲۔ "مائدہ لذت درد" سے شاعر کیا بتانا چاہتا ہے، اپنے الفاظ میں لکھے۔

۳۔ بتائیے کہ دہر میں لفظ "وفا" کا شرمندہء معنی کا نہ ہونا کیا ہے۔

جواب: سوال ۱، ۲، ۳، کے لئے 3.2.1، 3.3.1، 3.4.1، 3.5.1 کے تحت دیکھئے۔

3.6 غزل ۱۰: ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے بیداد کا دشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرہء خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کا
لیا دانتوں میں جو تنکا ہو اریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہء تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مداراب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتو نقش خیالِ یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادہء راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

3.61 غزل کی تشریح :

شعر۱: ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر بے توقیری بہشت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور بے خودوں کے بہشت کو گلدستہء طاق نسیاں سے تعبیر کرنا یہ غالبؔ کا ہی کمال ہے، مطلب یہ کہ زاہد جنت کے باغ کی اس قدر مدح سرائی کر رہا ہے کہ ہمیں ایسے لگ رہا ہے کوئی گلدستہ ہم محراب میں رکھ کر بھول گئے ہیں، لیکن بباطن شعر کا یہ مطلب ہے کہ شاعر جنت کا منکر نہیں ہے، لیکن ایک عام تصور سے انکار کرتا ہے یعنی یہ باغ رضواں کوئی آرام و آسائش کی جگہ نہیں ہے بلکہ خدا کے قریب پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے، اسلئے شاعر یہ واضح کرتا ہے کہ اے زاہد تم اس کی حقیقت کو بھول گئے ہو اپنی ذات سے بے گانہ ہو گئے ہو تمہیں چاہئے اس ذات واحد کی یاد میں اس قدر محو ہو جاؤ کہ کسی اور کا تصور بھی تمہارے نزدیک نہ آئے۔

شعر۲: بیاں کیا کیجئے بیداد کاوشہائے مژگاں کا۔۔۔۔

شرح شعر یہ کہ میں اپنے محبوب کے مژگاں کی تعریف کیا کروں یہ گویا خون کے قطرے ہیں جو تسبیح مرجاں کے دانوں کی طرح چھیدے گئے ہیں، یعنی شاعر اپنے محبوب کی بے التفاتی کا ذکر کرتا ہے اور اسکی پلکوں کو چھدے ہوئے دیکھ کر کہتا ہے کہ اس کی کوششوں کا کیا ذکر کریں اسی کی وجہ سے ہمارے آنسو نکل آئے اور یہ آنسو خون کے قطروں کی طرح ہیں اور یہ خون کے قطرے تسبیح مرجاں کی طرح ایک لڑی میں پرودئے گئے ہیں اور یہ چھیدنے کا کام بڑی جگر کاوی کا کام ہے اور شاعر اپنے خون جگر سے سینچ کر اسے ایک نیا فارم عطا کرتا ہے۔

شعر۳: نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کا۔۔۔۔

میرے نالوں کو میری آہ و بکا کو قاتل کا رعب و دبدبہ بھی روک نہیں سکا، اور میں نے اپنے نالوں کو روکنے کے لئے دانتوں میں تنکا پکڑ لیا اور وہ نیستان بن گیا، نالوں میں شامل ہو کر اور زور سے اظہار کرنے لگا یعنی نالے کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئے۔ مراد یہ کہ معشوق پر محبوب کا کوئی رعب وہ دبدبہ نہیں پڑ سکتا۔ اسلئے اسے عاجزی و انکساری اختیار کرنی چاہئے جس سے وہ اپنے نالوں میں کمی لا سکتا ہے اور جذبات کو قابو میں رکھ سکتا ہے اور اگر زبردسی کی جائے تو اس کی نالہء کشی میں اور اضافہ ہوگا، تب اسے

کوئی بھی طاقت روک نہیں سکتی۔

شعر۴: دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ اگر زمانے نے مجھے فرصت دی تو میں زمانے کو ایک تماشا دکھاؤں گا لیکن میرے دل کا ہر داغ سرو چراغاں کا بیج بنا ہے، یعنی اگر مجھے زمانے کے حادثات سے چھٹکارا ملا تو میں ثابت کردوں گا اور دکھادوں گا کہ میرے دل کا ہر داغ سروِ چراغاں کی مانند ہے، یعنی ہر داغ روشن اور واضح ہے ہر داغ میں ایک کہانی چھپی ہے اور میں اپنے داغوں سے زمانے پر اپنی حقیقت عیاں کردوں گا، اور اپنی ہستی پر پڑے فراموشی کے پردوں کو چاک کردوں گا، اس شعر میں شاعر داغ کو تخم سے تشبیہہ دے کر ایک عمدہ شعری پیکر بنایا ہے، یہ غالب کا ہی کمالِ فن ہے۔

شعر۵: کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہء تیرے جلوے نے۔۔۔۔۔

اے محبوب! تیرے جلوے نے یعنی تیرے سراپے نے آئینہ خانے کو بھی مات کردیا، جیسے کہ آفتاب کے ابھرتے ہی شبنم اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی اسی طرح تیرے جلوے کے سامنے آئینہ خانہ بھی ٹھہر نہیں سکتا، مطلب یہ کہ خورشید کی کرنوں سے جس طرح شبنم چمکتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد معدوم ہوجاتی ہے، ایسے ہی تیرے جلوے سے آئینہ خانے روشن ہوجاتے ہیں، مگر ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے، جس طرح شبنم کا ہوا یعنی تیرے جلوؤں کی تاب نہ لاکر آئینہ خانے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں، لہٰذا میں ان کی اس حالت کا بیان تیرے سامنے کیوں کر کروں گا، محبوب کے روشن چہرے اور اسکے جلوے سے آئینہ کا ٹوٹ جانا مراد لیا ہے۔

شعر۶: مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔۔۔۔۔

میری تعمیری جذبوں میں بھی تخریبی جذبوں کا شمار ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی دہقان اپنی کوششوں سے اپنے ہی غلے پر برق گرادے یعنی میں وہ دہقان ہوں جس کی کوشش وسرگرمی خود اس کے خرمن کے لئے بجلی کا کام کرتی ہے یعنی بجلی کا گرنا اور صورت خرابی سے شاعر فنا کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ فعل قدرت نے اپنے ہاتھوں پہلے ہی انجام دے دیا اور لفظ تعمیر بقا کی طرف اشارہ کررہا ہے اور بقا صرف خدا کی ذات میں مضمر ہے، اس شعر میں تعمیر وتخریب، بہار وخزاں، بقا وفنا کا امتزاج ملتا ہے، اور

فلسفیانہ حقیقت نگاری اور شاعرانہ نازک خیالی کا بڑا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔

شعر۷: اگا ہے گھر میں سو سبزہ ویرانی تماشا کر۔۔۔۔۔

اس شعر کے ذریعے شاعر عشق کی وجہ سے ہوئی تباہ حالی اور بربادی کا ذکر کر رہا ہے، کہتا ہے کہ گھر میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اگا ہوا ہے، اور گھر کی ویرانی کا تقاضا پورا کر رہا ہے، اور اب میرے دربان کا کام صرف گھاس کھودنا ہے یعنی شاعر یہاں یہ کہنا چاہتا ہے کہ گھر میں گھاس کا اگنا ویرانی کی نشانی ہے اور اس ویرانی کو ختم کرنے کے لئے دربان اگی ہوئی گھاس کو کھرچ کھرچ کر پھینک رہا ہے، اس کا کام تو گھر کی نگہبانی کرنا تھا وہ دربان بنا تھا، لیکن اس گھاس کی وجہ سے اس نے خود کو گھاس کھودنے کے کام پر معمور کر لیا ہے۔ وہ س گھر میں پھیلی ہوئی ویرانی کو کم کرنا چاہتا ہے، کیونکہ گھر میں ہر سو پھیلی ہوئی ویرانی کو دیکھ کر کوئی نہیں آتا اس غیر ضروری گھاس کی وجہ سے اپنے بھی غیر بن گئے ہیں۔ سو دربان اس غیر ضروری گھاس کو نکال کر گھر میں پھیلی ہوئی اجنبیت کو کم کرنا چاہتا ہے۔

شعر۸: خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں۔۔۔۔۔

میری خموشی کی وجہ سے چھپی ہوئی آرزوئیں ختم ہوئی ہیں جبکہ میں بجھا ہوا چراغ ہوں اور یہ میری بے زبانی اس حد تک ہے کہ یہ گور غریباں کی طرح ہے یعنی میری بہت سی آرزویں میری خواہشات، سارے جذبے میری خاموشی کی نذر ہو گئے ہیں، میری مثال ایسی ہی ہو گئی ہے، جیسے کہ کوئی بجھے ہوئے چراغ کی ہوتی ہے۔ یعنی بے زباں کسی قبر کے بجھے ہوئے چراغ کی طرح جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، جس سے کسی کو اس کے جذبوں کی خبر نہیں ہوتی اور کسی کو اس کی بے زبانی کا اندازہ نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی ساری آرزوئیں اس کی خاموشی میں چھپ گئی ہیں معدوم ہو گئی ہیں کیونکہ چراغ مردہ بن گیا ہے، بے زبان گور غریباں کی طرح اس شعر میں شاعر خموشی و بے زبانی میں خوں گشتہ اور چراغ مردہ، اور بے زبانی میں مناسبت ظاہر کی ہے، اور یہ شعر مناسبت لفظی کی عمدہ مثال ہے۔

شعر۹: ہنوز اک پرتو نقش خیالِ یار باقی ہے۔۔۔۔۔

اب تک میرے دل میں محبوب کا ایک خیال سا باقی ہے مگر میرے دل پر غم چھایا ہوا ہے گویا ایک تاریک کمرے کی طرح ہے، جیسے یوسفؑ کا زنداں تھا یعنی شاعر یہ جتانا چاہتا ہے کہ میں نے ابھی تک

اپنے محبوب کو یاد رکھا ہے ہے اس کی ایک شبیہہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے، لیکن میرا غم گیں دل حسرتوں اور غموں میں ڈوبا ہوا ہے اور حجرہ ء یوسف کا زنداں بنا ہوا ہے۔ لیکن محبوب کے خیال کی وجہ سے یہ تنگ و تاریک کوٹھری بھی خوب روشن ہوگئی ہے شاعر نے یہاں یوسفؑ کی تلمیح اس لئے استعمال کی ہے کہ حسن یوسفؑ سے جس طرح قید خانہ روشن ہو گیا تھا، اسی طرح نقش خیال یار سے دل افسردہ بھی کھل اٹھا تھا، اس شعر میں تصور جاناں کی دلکشی کا ذکر ملتا ہے۔

شعر۱۰: بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ۔۔۔۔۔

شاعر نے اس شعر میں محبوب سے شکوہ کیا ہے کہ اے محبوب! میرے خواب میں آ کر مسکرانے کا سبب کیا ہے آپ تو رقیب کے بغل میں سوئے تھے اس سے مراد یہ کہ شاعر نے اپنے محبوب کو خواب میں مسکراتے ہوئے آنکھوں میں خوشی کی جوت لئے عشق برساتی نگاہوں سے دیکھا ہے، اور شاعر یہ جاننا چاہتا ہے کہ جب محبوب رقیب کے پاس ہوتا ہے اسے وصل کی راحتوں سے سرفراز کرتا ہے، اور شاعر کو فراق میں مبتلا کر کے بے التفاتی دکھا کر خواب میں آ کر مسکرانے کا سبب کیا ہے، آخر اس قدر حجاب آلود مسکراہٹ کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

شعر۱۱: نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! تیری پلکوں میں آنسو دیکھ کر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے یہ معلوم نہیں کہ تیرے آنسو دیکھ کر کتنے عشاق خود بھی روئے ہوں گے، گویا انکے دلوں پر قیامت گذر گئی انہیں کسی قدر رنج لاحق ہوا۔ آج تیری مژگاں آنسو بہا رہی ہیں، اور شاید یہ آنسو تیرے ظلم کی انتہا کا سوچ کر بہہ رہے ہوں گے، یعنی تیرے جور و ستم سے یا تیری بے التفائی کے باعث کس کس کا لہو پانی (غم سے کنایہ مراد لیا ہے) ہوا ہوگا، اور آج تیری آنکھیں خود ہی بہہ رہی ہیں، شاید یہ ندامت کے آنسو ہیں۔

شعر۱۲: نظر میں ہے ہماری جادہ ء راہ فنا غالب۔۔۔۔۔

اے غالب! ہمارے سامنے فنا کا راستہ ہے اور یہ راستہ ہمارے خیالات کی شیرازہ بندی کے لئے ہے یعنی اے غالب! ہمیشہ میری نگاہوں کے سامنے یہ فنا کا راستہ ہے اور مجھے یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ اس دنیا کی ہر شئے فنا ہونے والی ہے اور باقی رہنے والی صرف خدا کی ذات ہے، اور یہ بات میں کبھی نہیں بھول

پاتا کہ دنیا کی ہر شئے کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اسے ایک نہ ایک دن فنا ہی ہونا ہے، اور جو چیزیں اجزائے پریشاں کی طرح دنیا میں بکھری ہوئی ہیں انہیں بھی اسی راستے سے گذرنا ہے اور یہ بھی جادہء راہ فنا میں سمٹ جاتی ہیں، اس شعر میں شاعر نے یہ فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ہر شئے کا انجام فنا ہے اور جادہء فنا وہ شیرازہ ہے جو اجزائے پریشاں یعنی اوراق کائنات کی شیرازہ بند ہے، مطلب یہ کہ باہم مربوط کر دیتا ہے۔

3.7 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپ کو غالب کے دیوان سے ردیف الف کی پانچ اور غزلیں یعنی (۶ تا ۱۰) متن اور ان کی تشریح کے بارے میں واقف کرایا۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف غزلوں اور انکی تشریح سے غالب کے افکار و خیالات کیا ہیں، اس اکائی سے قبل کی اکائیوں میں غالبؔ کی حیات ادبی کارنامے، غالبؔ کی شاعری، غالبؔ کے دیوان کی ردیف الف کی ابتدائی پانچ غزلیں وغیرہ پر معلومات حاصل کیں یہ اکائی بھی اسی قبیل کی ہے، اور پچھلی اکائی کا تسلسل ہے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی اور آخر میں نمونہ امتحانی سولات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا، امید ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات :

ا۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجئے۔

ا۔ تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا ☆ اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

۲۔ بوئے گل نالہء دل، دودِ چراغ محفل ☆ جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

۳۔ دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی ☆ گر نفس جادہء سر منزل تقویٰ نہ ہوا

۴۔ بیان کیا کیجئے بے دادکاوش ہائے مژگاں کا ☆ کہ ہر اک قطرہء خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

II۔ مائدہ لذت درد سے شاعر کیا بتانا چاہتا ہے اپنے الفاظ میں لکھئے۔

III۔ بیان کیجئے کہ قیس کی ناکامیء محبت شوق کے ہر رنگ میں شاعر کو کیسے لگتی ہے۔

IV۔شاعرلفظ "وفا" کوشرمندہء معنی سے کیوں تعبیر کرتا ہے۔

V۔اسدخستہ جاں اور بے کفن لاش کے ذریعہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔

3.9 فرہنگ :

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شوق	آرزو،خواہش (عشق)	رقیب	دشمن
قیس	(نام مجنوں)،تلمیح	بسمل	گھائل
دود	دھواں	باب نبرد	قابل جنگ
ابھی فرد فرد تھا	ناتجربہ کار مبتدی	بیاباں نورد	رسے آوارہ دشت
ہررنگ	ہرطرح کے رنگ، ہرصورت	سروساماں	اسباب،معیشت
عریاں	ننگا، برہنہ	داد	تعریف
تنگیء دل	رنجیدہ خاطر	نوآموز	مبتدی
بوئے گل	پھول کی خوشبو	عشق نبرد پیشہ	عشق جومرد میدان کا طالب ہو
مائدہ	دسترخواں		
چارہ سازی	علاج	شمار سبحہ	تسبیح کے دانوں کوشمار کرنا
مرغوب	پسند	بفیض بیدلی	ناامیدی کی بدولت
کاکل سرکش	بے قابو زلف	سبزہء خط	آغاز خط
جادہ	راستہ	جنبش لب	لب کی حرکت
دانتوں میں تنکا لینا		اظہار عجز کرنا	
مضمر	پوشیدہ	ہنوز	ابھی
خوں گشتہ	خون شدہ	افعی	سانپ
گزرگاہ	راستہ	تقویٰ	پرہیزگاری

باغ رضواں   باغِ جنت   طاق نسیاں   وہ طاق جس پر کوئی چیز رکھ کر بھول جائیں

خون گرم   سرگرمیءکوشش

ستائش گر   مداح   بالائے طاق رکھنا   ترک کرنا

بہ یک کفن بردن صد دل   ایک جھپٹے میں سو دل اڑا لینا

بہ خوں غلطیدان   خون میں تڑپنا   ناامیدی جاوید   دائمی ناکامی

دم عیسیٰ (تلمیح)   حضرت عیسیٰ قم باذن اللہ کہہ کر مردوں میں جان ڈال دیتے تھے۔

سطوت   رعب، دبدبہ   آئینہ خانہ   شیش محل

پرتو   عکس   لہو پانی ہونا   رونا، گریہ کرنا

3.10 سفارشی کتب :

١۔ دیوانِ غالب   غالبؔ

٢۔ غالب اور (بوطیقا) (اشعار غالب کی تفہیم)   مشکور حسین آباد

٣۔ شرح دیوانِ اردو غالب   سید علی حیدر نظم طباطبائی

٤۔ شرح دیوان غالب   یوسف سلیم چشتی

٥۔ مطالعہءغالب   اثر لکھنوی

بلقیس بانو۔ ایم

صدر شعبہءاردو، کے ایس او یو، میسور

اکائی ۴ ـ : غالبؔ کی پانچ غزلیں اور تشریح (گیارہ تا پندرہ)

ساخت :

4.0 اغراض ومقاصد

4.1 تمہید

4.2 غالب کی پانچ غزلیں اور انکی تشریح (۱۱ تا ۱۵)

غزل ۱۱: نہ ہوگا اک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا۔۔۔۔

4.2.1 غزل کی تشریح

4.3 غزل ۱۲: سراپا رہن عشق وناگزیر الفت ہستی۔۔۔۔

4.3.1 غزل کی تشریح

4.4 غزل ۱۳: محرم نہیں ہے تو ہی، نواہائے راز کا۔

4.4.1 غزل کی تشریح

4.5 غزل ۱۴: بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا۔۔۔۔

4.5.1 غزل کی تشریح۔

4.6 غزل ۱۵: شب کہ برقِ سوز دل سے زہرہ ابر آب تھا۔۔۔

4.6.1 غزل کی تشریح۔

4.7 خلاصہ

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 سفارشی کتب

4.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو مکمل کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دیوان غالبؔ سے ردیف الف کی پانچ اور غزلیں (یعنی ۱۱ تا ۱۵) اور انکی تشریح کر سکیں۔

☆ نیز غالبؔ کے نظریات اور افکار سے واقف ہو سکیں اور اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

4.1 تمہید :

اس اکائی میں دیوان غالب سے ردیف الف کی پانچ اور غزلیں (یعنی ۱۱ تا ۱۵) لی گئی ہیں، اور ہر غزل کے ہر شعر کی تشریح بھی دی گئی ہے، یہ اکائی پچھلی اکائی کا تسلسل ہے، غالبؔ کا انداز بیان اردو کے دوسرے شعراء سے مختلف ہے، ان کا دیوان متضاد اور مختلف کیفیتوں کا مرقع ہے، ان کے ہاں تنوع، جدت، ندرت، معنی آفرینی، رعایت لفظی عمدہ شاعری کی ہر خصوصیت غالبؔ کی غزل میں جگہ پا گئی ہے۔ انکا نقطہء نظر، انکا منشا، اور مقصد انکا خیال اور جذبہء اس اکائی کے ذریعے بہ خوبی جان سکیں گے۔

4.2 غالب کی پانچ اور غزلیں اور انکی تشریح (۱۱ تا ۱۵)

غزل ۱۱: نہ ہوگا اک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

نہ ہوگا اک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا	حبابِ موجہء رفتار ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے	کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

4.2.1 غزل کی تشریح :

شعر ۱: نہ ہوگا اک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ میرا نقش قدم حباب سا ہے جس حباب کا ذوق سفر کبھی کم نہیں ہوسکتا، اسی طرح خواہ میں کتنا ہی تھک جاؤں مگر میرا ذوق صحرا نوردی کبھی کم نہیں ہوسکتا، مطلب یہ کہ بیاباں ماندگی سے عاشق کے ذوق صحرا نوردی میں کسی طرح کی کمی نہیں آسکتی کیونکہ معشوق کی خاصیت یہ ہے

کہ وہ محبوب میں مسلسل جدوجہد اور سعی پیہم کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

شعر۲: محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ محبت کرنے سے پہلے جب مجھے کوئی غم نہ تھا تو میں سیر و چمن سے لطف لیتا تھا، الفت و انسیت محسوس کرتا تھا، مگر اب مصائب عشق کی وجہ سے اس قدر افسردہ اور اندوہ گیں ہو گیا ہوں کہ باغ کی سیر تو خیر چھوڑیئے پھول سونگھنے سے بھی میرا دل بیزار ہو گیا ہے۔

4.3 غزل۱۲: سراپا رہن عشق ناگزیر الفت ہستی

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بہ قدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی — جو تو دریائے مئے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

شعر۱: سراپا رہن عشق ناگزیر الفت ہستی۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ انسان میں متضاد کیفیتیں ہوتی ہیں، وہ غیر سے بھی محبت کرتا ہے اور اپنی جان کو بھی محبوب و عزیز رکھتا ہے، یہی وجہ ہے، انسان کی زندگی ایک مستقل کشمکش میں مبتلا رہتی ہے، بلکہ یہ تمام تر جدوجہد زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت ہے اور زندگی کے تمام تر ہنگامے اسی جدوجہد و کشمکش پر منحصر ہیں۔ اگر یہ کیفیت نہ ہو تو زندگی میں یکسر جمود و ٹھہراؤ پیدا ہو جائیگا، مطلب یہ کہ میں سراپا رہن عشق ہوں یعنی مبتلائے عشق ہوں اور اپنی جان ہی سے محبت کرنے پر مجبور ہوں، میری مثال اس شخص کی سی ہے جو برق کی بھی پرستش کرتا ہے، اور جب وہی برق اس کے خرمن کو جلا دے تو اس پر افسوس بھی کرتا ہے۔

شعر۲: بہ قدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو خمیازہ ساحل قرار دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ ساحل کی طرح میں بھی تشنہ کام ہوں اسلئے طالب شراب ہوں یعنی اے ساقی! جس طرح مے نوشی میں مرا ظرف بہت

عالی ہے، یعنی مئے نوشی کی کوئی حد نہیں ہے، اسی طرح میری تشنہ کامی بھی حد سے بڑھی ہوئی ہے جس طرح ساحل ہر وقت دریا سے فیضیاب ہوتے رہنے کے باوجود تشنہ ہی رہتا ہے، اسی طرح تو مجھے جس قدر پلائے گا خمار تشنہ کامی بھی اسی قدر بڑھتا جائیگا، اگر تو پلانے میں دریا ہے تو میں پینے میں ساحل ہوں، نہ تیری انتہا ہے اور نہ میری، اس شعر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ انسان خواہ دنیا کا طالب ہو یا خدا کا، دونوں صورتوں میں اسکی تمناؤں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے خدا اگر تیری بخشش کی کوئی انتہا نہیں ہے تو میری تمناؤں کی بھی حد نہیں ہے، تیری نوازشیں لامحدود ہیں، تو میری آرزوئیں بھی غیر متناہی ہیں۔

4.4. غزل ۱۳ ے محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز — میں اور دکھ تیری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا و گرنہ میں — طعمہ ہوں، ایک ہی نفس جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے — ہر گوشہء بساط، ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز — ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا
تاراجِ کاوش غم ہجراں ہوا اسدؔ — سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

4.4 غزل کی تشریح :

شعر ۱: محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا۔۔۔۔۔

اے مخاطب! چونکہ تو محرم نواہائے راز نہیں ہے، اسلئے تو یہ سمجھتا ہے کہ حقیقت سراپا مستور ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے حقیقت مستور ہونے کے باوجود عریاں بھی ہے بلکہ مستوری بھی اسکے جلوے ہی کی ایک ادا ہے مطلب یہ کہ پردہ پوشی جسے تو حجاب یعنی پردہ سمجھتا ہے جو کسی شخص کو پوشیدہ کرے وہ

دراصل حجاب نہیں ہے بلکہ پردہ ساز ہے، جس سے نواہائے راز (حقیقت کے نغمے) سرزد ہورہے ہیں یعنی اشیائے کائنات جن کو تو حجابات سمجھ رہا ہے، دراصل وہ مظاہر ہیں جن سے حقیقت ظاہر ہورہی ہے اور ہر مظہر زبان حال سے اس کی ہستی پر گواہی دے رہا ہے یعنی اسرارِ الٰہی ظاہر کررہے ہیں۔

شعر۲: رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے۔۔۔۔۔

نظارہ محبوب نے میرا رنگ اڑادیا ہے، میری آشفتہ حالی محبوب کے عدیم المثال حسن و جمال کا باعث ہے، اس لئے محبوب کو حق پہنچتا ہے، کہ وہ اپنے حسن ادا پر ناز کرے اس شعر میں شاعر تاثیرِ حسن محبوب مراد لیا ہے، اور اس سے شاعرانہ، نازک خیالی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہی وہ انداز بیان ہے جس پر غالب کو ناز ہے۔

شعر۳: تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز۔۔۔۔۔

اے محبوب! تو رقیب کو بار بار الفت وانسیت کی نظروں سے دیکھ رہا ہے، اور چونکہ تیرے اس طرزِ عمل سے تیری نازک پلکوں کو تکلیف ہورہی ہے، مجھے تیری اس تکلیف سے بڑا دکھ ہورہا ہے، ایسے لگتا ہے گویا تیری محبت بھری نظریں فرطِ جذبہء رقابت ہے اور تیری پلکیں میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہیں۔

شعر۴: صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں۔۔۔۔۔

آہوں کو اسلئے ضبط کررہا ہوں، اس میں میرا ہی فائدہ ہے مطلب یہ کہ آتش عشق کی گرمی میرے سینہ میں اس قدر تپش پیدا کررہی ہے کہ ایک ہی آہ میری ہستی کو فنا بلکہ نیست ونابود کردینے کے لئے کافی ہے، شاعر عشق کی شدید کیفیت کو یہاں ظاہر کررہا ہے۔

شعر۵: ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ شراب میں اس قدر جوش پیدا ہوگیا ہے کہ شیشے گردش میں آگئے ہیں، یعنی بوتلیں خوشی سے اچھل رہی ہیں چونکہ محفل کے ہر گوشے میں شیشہ باز اپنے کمال اور کرتب بازی سے محفل کو سرگرم رکھے ہوئے ہیں گویا شراب کے لبریز شیشے فرش کے ہر گوشے میں رقص کررہے ہوں۔

شعر۶: کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ میرا دل ناخن سے کاوش مزید کا اس طرح تقاضہ کر رہا ہے جس طرح قرض خواہ مقروض سے قرض کی وصولیابی کا تقاضا کرتا ہے، گویا کاوش بمنزلہ قرض ہے جو ناخن پر واجب ہے مطلب یہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ناخن غم، زخم دل کو اپنی کاوش سے اتنا بڑھا دے کہ دل سراپا زخم بن جائے، تاکہ عاشقی کی معراج نصیب ہو جائے۔ مطلب یہ کہ ناخن سے کاوش کا تقاضا کرنا گویا ناخن پر قرض کا واجب ہونا ہے۔

شعر۷: تاراجِ کاوشِ غم ہجراں ہوا اسدؔ۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ میرا وہ سینہ جس میں گہرہائے راز مخفی تھے، کاوش غم ہجراں نے لوٹ لیا، یعنی شدت غم ہجراں نے راز عشق کو فاش کر دیا، مطلب یہ کہ کمالِ ذوق عشق یہ ہے کہ جان جائے مگر راز عشق فاش نہ ہو۔ یعنی محبوب رسوا نہ ہو، یہ اسلئے کہ غم رسوائی محبوب نہ ہو۔ لہذا میرے سینہ میں راز محبوب مخفی تھے، جیسے موتی دفینے میں مخفی ہوتے ہیں، مگر افسوس کہ کاوشِ غم ہجراں (مفارقت کے غم) نے اس دفینے کو تباہ و برباد کر دیا ہے، یعنی شدت غم ہجراں نے راز عشق ظاہر کر دیا ہے۔

4.5 غزل ۱۴ ء : بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا۔۔

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا — رکھیو یارب یہ درگنجینہء گوہر کھلا!
شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا — اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا!
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھل کھلا!
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا!
ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا!
منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھل کھلا!
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کہ کیسا پھر گیا — جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہو بستر کھلا!
کیوں اندھیری ہے شبنم غم؟ ہے بلاؤں کا نزول — آج ادھر ہی کو رہے گا، دیدہء اختر کھلا!

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال　　نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ برا اکثر کھلا!
اسکی امّت میں ہوں، میں میرے رہیں کیوں کام بند　　واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا!

4.5.1 غزل کی تشریح :

شعر۱: بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا۔۔۔۔۔

بادشاہ وقت سخن پرور تھا اور اسی سخن پروری کی وجہ سے مشاعروں کا سلسلہ چل پڑا تو شاعر بارگاہِ خداوندی میں دعا گو ہے کہ یہ سلسلہ یونہی قائم رہے، مشاعرے یوں ہی چلتے رہیں اور بادشاہ سخن وروں کو یوں ہی عزت واکرام سے نوازتا رہے۔

شعر۲: شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر ستاروں کی دلکشی اور حسن آفریں منظر کی عکاسی کر رہا ہے کہتا ہے کہ رات کے وقت چمکیلے ستاروں ایسے دلکش انداز کے ساتھ آسماں پر نمودار ہوئے جیسے کسی بت خانے میں بہت سی مورتیاں اپنا جلوہ دکھا رہی ہوں۔

شعر۳: گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر دوستوں کی منافقانہ روش کو ظاہر کر رہا ہے، کہتا ہے کہ اگرچہ میں دیوانہ ہوں، تاہم میں دوست و دشمن میں تمیز کر سکتا ہوں، یعنی میں دوست نما دشمن کو خوب پہچانتا ہوں، اس کے فریب میں نہیں آتا، اس نے مجھے دکھانے کے لئے ہاتھ میں نشتر رکھا ہے تا کہ میں یہ سمجھوں کہ میرے جنوں کا علاج کرنا چاہتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اسکا ارادہ میرے علاج کا نہیں ہے، بلکہ مجھے ختم کرنے کا ہے، اس نے آستین میں دشنہ (کنایۃ ایذا پہنچانا خنجر چھرا کے معنوں میں لیا ہے) چھپا رکھا ہے۔

شعر۴: گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر محبوب کی بے تکلفی کو خوشی و مسرت کے ساتھ ظاہر کر رہا ہے کہ اگرچہ میں محبوب کی باتوں کو سمجھ سکتا ہوں اور نہ ہی اس کے دلی ارادوں کو جان سکتا ہوں، لیکن یہ میرے لئے بہت مسرت کا مقام ہے کہ وہ میرے ساتھ بڑا بے تکلف ہو گیا ہے۔

شعر۵: ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال۔۔۔۔۔

شاعر تصور محبوب کو بھی حسن عمل قرار دے رہا ہے کہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی تصور حسن جاناں میں محو ہونے کی وجہ سے قبر میں بھی جنت کا لطف حاصل کر رہا ہوں، مطلب یہ کہ محویت کا یہ عالم ہے کہ خیال یار میں بھی بجائے خود ایک نیکی کا عمل ہے اس لئے ایک عاشق بھی کسی زاہد یا عابد سے کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد میری قبر میں جنت کی کھڑکی کھل گئی یعنی میں بھی بہشتیوں میں شامل ہو گیا، یعنی خیال حسن میں بھی حسن عمل کا رنگ پایا جاتا ہے۔

شعر۶: منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ دلکشی کا ایسا عالم کہیں نہیں دیکھا یعنی ایسی دلکشی کسی معشوق میں نہیں دیکھی، کھلا بمعنی باعث زینت یا موجب دلکشی بن گیا مطلب یہ کہ اگر چہ محبوب کے رخ روشن پر بکھری ہوئی زلفیں بھی بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں، مگر میرے محبوب کے چہرے پر نقاب اس سے بھی زیادہ دلکش ہوتی ہے، حالانکہ اس کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ ہے، اس کے باوجود اس کی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

شعر۷: در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کہ کیسا پھر گیا۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر محبوب کی شوخی اور نزاکت بیان کو مکر جانے سے تعبیر کرتے ہوئے شوخی کا نام دے رہا ہے، کہتا ہے کہ میرے التماس پر محبوب نے مجھے اپنے در پر پڑے رہنے کی اجازت تو دے دی مگر اس کی شوخی تو دیکھئے کہ مجھے بھروسہ دلا کر مکر رہا ہے یعنی میرے لپٹے ہوئے بستر کے کھولنے کی دیر تھی کہ کہہ دیا یہاں سے اٹھ جاؤں، یہ محبوب کی شوخی ہے یا ستم ظریفی۔

شعر۸: کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول۔۔۔۔

اس شعر میں استفہامیہ انداز ہے شاعر کہتا ہے کہ شب غم اس قدر تاریک کیوں ہے، اور اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دے رہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آسمان سے ایسی بلائیں نازل ہو رہی ہیں جنہیں آج تک ستاروں (چشم فلک) نے نہیں دیکھا تھا، اس لئے تمام ستارے دنیا کی طرف دیکھنے کے بجائے عالم بالا کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

شعر۹: کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال۔۔۔۔

میں اجنبی دیس میں کیوں کر خوش رہ سکتا ہوں، جبکہ حوادث کا یہ عالم ہے کہ وطن سے جو بھی خط آتا ہے، وہ اکثر کھلا رہتا ہے، یعنی کھلا ہوا نامہ کنایۃ موت کی خبر لے لیا ہے،، یعنی بری خبر یا حادثہ جس سے دکھ ہو، مطلب یہ کہ یہاں شاعر اپنے شدت غم اور مصائب سے پریشان ہے جو بیان کرنا چاہتا ہے۔

شعر۱۰: اسکی امّت میں ہوں، میں میرے رہیں کیوں کام بند۔۔۔۔۔

شاعر خود سے مخاطب ہے کہتا ہے کہ اے غالب! میں عظیم مرتبے والے رسول اللہ کی امت سے ہوں، جس کے گنبد بے در کھل گیا (یعنی گنبد بے در سے آسمان مراد لیا ہے) جو ہمیشہ بند رہتا ہے، کسی کے لئے نہیں کھلتا تو بھلا میرا کام کیسے بند رہ سکتا ہے، یعنی میرے مقاصد بھی ضرور پورے ہوں گے، میں کبھی ناکام نہیں ہوسکتا، گویا۔ دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جوابات :

۱۔ شاعر "بیاباں ماندگی" اور عاشق کے ذوق صحرا نوردی، کو کیا کہتا ہے۔

۲۔ شاعر "سراپا رہن عشق" کے ذریعے کیا کہنا چاہتا ہے؟

۳۔ "رنگ شکستہ" اور "صبح بہار نظارہ" سے شاعر کیا مراد لیتا ہے بتائیے۔

۴۔ "دوست کے فریب" اور "آستین میں دشنہ" پر شاعر کیا کہتا ہے۔

جواب کے لئے۔ 4.2.1، 4.3.1، 4.4.1، 4.5.1 کے تحت دیکھئے۔

4.6 غزل ۱۰ ہ : شب کے برق سوز دل سے زہرہ ابر آب تھا

شب کے برق سوز دل سے زہرہ ابر آب تھا — شعلہ جوالہ ہر ایک حلقہء گرداب تھا

واں کرم کو عذر بارش، تھا عناں گیر خرام — گریہ سے یاں پنبہء بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال — یاں ہجوم اشک میں تارنگہ نایاب تھا

جلوہء گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو　　یاں رواں مژگاں چشم تر سے خونِ ناب تھا
یاں سر پر شور بیخوابی سے تھا دیوار جو　　واں وہ فرق ناز محو بالشِ کم خواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بیخودی　　جلوہء گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا　　دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

4.6.1 غزل کی تشریح :

شعر۱: شب کے برق سوز دل سے زہرہء ابر آب تھا۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ بادل جو آگ کو بجھا سکتا ہے، میرے دل کی گرمی سے خوف زدہ تھا کہ کہیں یہ بجلی میرے سوز دل کو جلا کر خاک نہ کر دے، مطلب یہ کہ رات کو میرے دلکی سوزش کو دیکھ کر بادل کا پتہ مارے خوف کے پانی ہو کر بہہ گیا، اس میں بھی اس قدر حرارت سرایت کر گئی کہ اس میں جو بھنور پڑتا تھا، وہ بھی شعلہء جوالہ معلوم ہوتا تھا، شاعر کے شاعرانہ خیال بندی کا یہ کمال ہے۔

شعر۲: واں کرم کو عذر بارش، تھا عناں گیر خرام۔۔۔۔۔

میرا محبوب بارش کی وجہ سے تشریف لانے سے قاصر ہے، اور یہاں شدت گریہ کا یہ عالم تھا کہ تکیہ کی روئی (پنبہء بالش) آنسوؤں میں کف سیلاب کی طرح تیر رہی تھی، مطلب یہ کہ شاعر شعر میں محبوب کے فراق میں کثرت گریہ کر رہا ہے۔

شعر۳: واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ محبوب اپنے بالوں میں موتی پرو رہا تھا، اور میں تار نگاہ میں ذرا شک پرو رہا تھا، اور میں نے یہ موتی اس کثرت سے پروئے کہ تار نگاہ بالکل چھپ گیا، مطلب یہ کہ اس شعر میں رونے کی کثرت اور محبوب کا تصورِ خیال اس کی آمد کا انتظار شاعر اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے ہے۔

شعر۴: جلوہء گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ وہاں جلوہء گل نے آب جو کو چراغاں کر دیا تھا، یعنی باغ میں گلاب کے

پھولوں کی وہ کثرت تھی کہ نہر کے پانی میں چراغاں کا سماں نظر آ رہا تھا، ادھر میری پلکوں سے خون کے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی جس سے گلاب اور خون دونوں سرخ ہو رہے تھے۔

شعر۵: یاں سر پر شور بیخوابی سے تھا دیوار جو۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر محبوب کے فراق میں اپنی شدت گریہ اور بے قراری ظاہر کر رہا ہے، کہتا ہے کہ ہم محبوب کے فراق میں نیند نہ آنے کی وجہ سے دیوار کی تلاش میں تھے، تا کہ اس سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لیں اور ادھر محبوب خواب کے تکیہ پر اپنا سر پر غرور کے محو خواب تھا، اس شعر میں شاعر کم خواب اور بے خوابی کے توسط سے شعر میں نہایت شاعرانہ خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعر۶: یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بیخودی۔۔۔۔۔

شاعر کہتا ہے کہ ادھر ہماری بزمِ بے خودی میں ہماری آہ کی شمع روشن تھی اور ادھر محبوب کی محفل میں انکے احباب کے لئے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا، یعنی ہم صدمہء فراق سے بے خود مصروف آہ و نالہ تھے، اور محبوب رقیبوں کے ساتھ محوِ عیش و طرب تھا۔

شعر۷: فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا۔۔۔۔۔

شرح شعر یہ ہے کہ وہ میرے رقیبوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے تھے، (یعنی داد عیش دے رہے تھے) اور میں آتش فراق میں سر سے پاؤں تک جل رہا تھا، یعنی انکی جدائی میں مرا یہ حال تھا کہ ساری کائنات کو آگ لگا دینے کو جی چاہ رہا تھا، یعنی محبوب کی محفل میں فرش سے لیکر عرش تک اور عیش و نشاط کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا، اور ادھر میں آتش فراق میں جل رہا تھا۔

شعر۸: تا گہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا۔۔۔۔۔

اس شعر میں شاعر تحریک غزل گوئی کا ذکر کر رہا ہے کہ نا چاہتے ہوئے بھی مرا دل شدت گریہ اور غم سے لذت اندوز ہو رہا ہے، اس طرح جیسے خون کے آنسو بہا رہا ہو۔ اس رنگ سے یعنی اس انداز سے خون نابہ یعنی خالص خون، کاوش ناخن یعنی کاوش غم، دل کا ذوق لذت یاب اس شعر میں غالب کا یہ کمال اور رعایت لفظی کی عمدہ مثال بھی ہے۔

4.7 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپکو غالبؔ کے دیوان سے ردیف الف کی پانچ اور غزلیں یعنی (۱۱ تا ۱۵) متن اور انکی تشریح کے بارے میں واقف کرایا، اغراض ومقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف غزلوں اور انکی تشریح سے غالب کے نظریات کیا ہیں، غالب کی جدت طرازی شعر میں رعایت لفظی کا استعمال نئے تشبیہات و استعارے وغیرہ اس اکائی میں اور اس اکائی سے قبل کی اکائیوں میں غالب کی حیات ادبی کارنامے غالب کی شاعری، غالب کے دیوان کی ردیف الف کی ابتدائی پندرہ غزلیں معنی ومطالب کے ساتھ آپ نے معلومات حاصل کیں۔ یہ اکائی پچھلی اکائی کا تسلسل ہے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی اور آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا، امید ہے کہ آپ اس سے استفادہ کریں گے۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ درجِ ذیل اشعار کی تشریح کیجئے۔

۱۔ محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے ☆ کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

۲۔ تاراجِ کاوش، غم ہجراں ہوا اسدؔ ☆ سینہء کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۳۔ ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال ☆ خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

۴۔ اسکی امت میں ہوں، میں میرے رہیں کیوں کام بند ☆ واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

۵۔ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال ☆ یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا

2۔ شاعر "بیاباں ماندگی" اور عاشق کے ذوق صحرانوردی، کے ذریعے کیا کہنا چاہتا ہے۔

3۔ بتائیے کہ 'رنگ شکستہ اور صبح بہار نظارہ' کیا ہے۔

4۔ 'دوست کے فریب' اور 'آستیں میں دشنہ'، پر شاعر کیا کہتا ہے۔

5۔ شب کے برقِ سوز دل سے زہرہء "ابر آب" کا ہونا کیا مراد ہے۔

6۔ "پنبہء بالش کف سیلاب"، کے بارے میں شاعر کیا کہتا ہے۔

4.9 فرهنگ :

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
یک بیاباں ماندگی	اتنی تھکن جو ایک بیاباں کی آوارگی سے پیدا ہو، بہت تھکن		
بے دماغی	نفرت	ناک میں دم آنا	بیزار ہونا
بقدر ظرف	حوصلہ کے مطابق	محرم	آشنا، واقف کار
راز	پوشیدہ	طعمہ	لقمہ
گرہ نیم بار	آدھی کھلی ہوئی گرہ	پردہ	حجاب
جاں گداز	جان کو پگھلانے والا	اشعار کا دفتر کھلا	مشاعرہ جاری ہو گیا
گنجینہء گوہر	بزم شعراء یا دربار	خیال حسن	تصور جاناں
غربت	مسافری، اجنبی	حباب	بلبلہ
موجہء	موج	ناگزیر الفت ہستی	اپنی جان سے محبت کرنے پر مجبور
خمار	نشہ	خمیازہ	انگڑائی
نوا	آواز	رنگ شکستہ	{اڑا ہوا رنگ،
دشنہ	خنجر، چھری		آشفتہ حالی، پریشانی}
کاوش	کردیدنا، کھودنا	دفینہ	پوشیدہ، خزانہ
صبح بہار	صبح کے وقت روشن منظر		بساط فرش
حسن عمل	نیک کام کرنا	منہ پر کھلنا	زیب دینا
کھلا	بے تکلفی		نشتر زخم
گنبد بے در کھلنا	آسمان میں شگاف ہونا	برق سوز دل	تپش قلب کی بجلی
نارنگہ نایاب ہونا	دکھائی نہ دینا	پتہ پانی ہونا	خوف زدہ ہونا
پنبہء بالش	روئی کا تکیہ	کرم کو	تشریف لانا
کم خواب	ایک قیمتی کپڑا	موج رنگ	عیش وعشرت

کاوش ناخن	کاوش غم	شعلہ جوالہ	گردش کرنے والا شعلہ
زہرہ ءابر آب ہونا	بادلوں کا پتہ بھی پانی پانی ہونا		
عنان گیر	مانع	کف سیلاب	سیلاب کا جھاگ
محو بالش	محبوب کا محو خواب ہونا	خوں نابہ	خونِ خالص
سوختن کا باب	ساری کائنات کا جلا دینا، مراد رنج والم		
ذوق	لذت یابی	دشنہ	خنجر، چھری
فرش سے عرش	زمین سے آسمان تک	خرام	ناز کی چال
دشنہ	خنجر، چھری		

4.10 سفارشی کتب :

ا۔نقد غالب	مختار الدین آرزو
۲۔یادگارِ غالب	مولانا الطاف حسین حالی
۳۔شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی
۴۔مطالعہ غالب	اثر لکھنوئی
۵۔دیوان غالب	مرزا غالب
۶۔غالب اور بوطیقا (اشعار غالب کی تفہیم)	مشکور حسین آباد
۷۔شرح دیوان اردو غالب	سید علی حیدر نظم طباطبائی

بلقیس بانو۔یم

چیر پرسن، شعبہ ءاردو

کے یس او یو، میسور

Karnataka State Open University

Manasagangothri, Mysore

Optional Urdu - I BA

Paper 1 - Course 1

Poetry, Prose

Block - 2 Unit 5-8

اکائیاں:8 - 5 باب:2

اردو ادب : اختیاری مضمون

بی اے ،تین سالہ ڈگری کورس

سالِ اوّل - بی اے - پرچہ اوّل

نظم ونثر

(بلاک:2۔اکائیاں:5-8)

١۔ شیخ الجامعه

پروفیسر کے ۔یس رنگاپا

٢۔ ڈین اکاڈمك

پروفیسر۔ جگدیشه

٣۔ فیکلٹی ممبرس

١۔ یم بلقیس بانو؛ صدرشعبہ اردو وکوآرڈینیٹر، کے یس اویو، میسور

٤۔ ڈاکٹر جهان آراء بیگم؛ پروفیسر شعبہءاردو، کے یس اویو۔ میسور

٤۔ اراکین بورڈ :

١۔ بلقیس بانو۔ یم، چیئر پرسن (یو جی (بی اویس))

٢۔ پروفیسر جهاں آراء بیگم ممبر۔

٣۔ ڈاکٹر محمد صبغت الله ممبر۔

٤۔ ڈاکٹر محمد ثناء الله شریف ممبر۔

٥۔ پروفیسر نصرت جهاں ممبر۔

٥۔ مصنف :

پروفیسر افروز احمد ،وظیفہ یاب پروفیسر، جے یس یس کالج ،اوٹی روڈ، میسور

٦۔ مدیرہ :

پروفیسر ممتاز زرینه ،وظیفہ یاب پرنسپل، مہاراجاس کالج، میسور

نصاب کا مقصد

یہ کتاب اردو ادب اختیاری مضمون کا ایک جزو ہے، جو بی اے سال اول کے کورس میں رکھی گئی ہے، پہلے باب یعنی بلاک-1 میں دیوان غالبؔ سے "ردیف الیف" کی غزلیات کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ باب 4-1 اکائیوں پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب یعنے بلاک 2 میں انتخاب کلام میرؔ (مرتب مولوی عبدالحق) سے منتخب غزلیں اور مثنویاں شامل ہیں۔ غزلوں اور مثنویوں کی تشریح اور تجزیئے کے ساتھ ساتھ شاعر کا تعارف انکی غزل اور نظم نگاری میں اہمیت اور انکے کلام کی خصوصیات بھی پیش کی گئی ہیں، تا کہ نصاب میں شامل اس شاعر کے کلام سے آپ لطف اندوز ہوں اور بھر پور استفادہ کریں، یہ باب 8-5 اکائیوں پر مشتمل ہے۔

مذکورہ ابواب نظم کے لئے مختص ہیں، سالِ اوّل بی اے کے اختیاری مضمون کے کورس 1 میں یہ نصاب شامل ہے، اس کے علاوہ اس باب میں طلبہ کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے منتخب سوالات بھی دیئے گئے ہیں، تا کہ طلبہ اس سے مزید مستفید ہوسکیں، ہر اکائی میں مشکل الفاظ آتے ہیں، انکے معنی بھی دیئے گئے ہیں، اور اکائی کے آخر میں سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، امید ہے کہ طلبہ انہیں حاصل کر کے پڑھیں گے، اور مزید اپنی معلومات کو بڑھائیں گے۔

باب ۔ ۲

یہ باب بی اے سال اول کے اختیاری مضمون کے لئے مخصوص ہے اور اردو نظم کا ایک جزو ہے، یہ باب 8-5 اکائیوں پر یعنی کل 4 اکائیوں پر مشتمل ہے۔

اکائی ۵: کے تحت میرؔ کی حیات اور شاعری کی اہم گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے، جس سے انکی شاعرانہ عظمت انکی شخصیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اکائی ۶: کے تحت میر کی غزل گوئی اور منتخب پانچ (۵) غزلوں کو پیش کر کے ساتھ ہی انکی تشریح بھی دی گئی ہے۔

اکائی ۷: کے تحت میر کی اور پانچ (۵) غزلوں کو پیش کیا ہے، اور ساتھ ہی انکی تشریح بھی دی ہے

اکائی ۸: کے تحت میر کی نظم گوئی اس کی خصوصیات اور ساتھ ہی تین مختلف عنوانات پر مشتمل مثنویوں کا متن اور اس کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ باب میں جتنی بھی اکائیاں ہیں ان میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، ہر اس اکائی سے متعلق دیگر تفصیلات پر بھی معلومات فراہم کئے گئے ہیں، تا کہ طلبہ کو اکائی کے سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو۔

مشمولات

حصہ نظم : باب 2 ۔ اکائیاں (5-8)

کتاب : انتخاب کلام میرؔ : مولوی عبدالحق

اکائی نمبر	عنوان
5 اکائی	میرؔ کی حیات وشاعری
6 اکائی	میرؔ کی منتخب پانچ غزلیں
7 اکائی	میرؔ کی منتخب پانچ غزلیں
8 اکائی	میر کی منتخب نظمیں

(جھوٹ، دنیا، شہر آشوب)

اکائی ۵ : انتخاب کلامِ میرؔ از : مولوی عبدالحق

ساخت :

5.0 اغراض ومقاصد

5.1 تمہید

5.2 میرؔ کی حیات وشاعری

5.3 خلاصہ

5.4 نمونہ امتحانی سوالات

5.5 فرہنگ

5.6 سفارشی کتب

5.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ میرؔ کی زندگی، حالات اور اس سے جڑی شاعری اپنے طور پر بیان کرسکیں، اور ان کی شاعری کے پس منظر کو سمجھ سکیں۔

5.1 تمہید :

اس اکائی میں میرؔ کی پیدائش ان کی زندگی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی شاعری کی ابتداء اور مختلف مدارج بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے ان کی شاعری کے کمالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے میرؔ کی شاعری کو سمجھنے میں آپ کو بڑی مدد ملے گی۔

5.2 میرؔ کی حیات اور شاعری : (1724 - 1810)

میرؔ کا پورا نام محمد تقی تھا، اور میرؔ تخلص۔ میرؔ نے اپنے بزرگوں کا احوال اپنی خودنوشت سوانح "ذکر میرؔ" میں لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انکے آباواجداد زمانے کی مشکلات کی وجہ سے حجاز سے روانہ ہوکر سرحد دکن پہنچے۔ راستے میں بڑی مصیبتیں اٹھائیں، اس کے بعد احمد آباد گجرات پہنچے، بعض وہیں رہ گئے لیکن بزرگ اعلیٰ تلاش معاش میں آگے بڑھے اور اکبرآباد جو آج آگرہ کہلاتا ہے پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ ان کے دادا نے فوجداری اختیار کی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو خلل دماغ تھا، جوانی میں مرگئے۔ چھوٹے بیٹے محمد علی متقی میرؔ کے والد تھے، میرؔ کے والد نے درویشی اختیار کی، اور گوشہ نشین ہوگئے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں پہلی بیوی سراج الدین علی خان آرزوؔ کی بہن تھیں دوسری بیوی کے بطن سے میرؔ صاحب پیدا ہوئے۔ میرؔ کے والد صوفی منش بزرگ تھے۔ انہوں نے شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کی صحبت میں بڑی بڑی ریاضتیں کیں اور درویشی کے اعلیٰ مقام تک پہنچے۔ ان کی معاشرے میں بڑی عزت وتوقیر تھی۔ میرؔ کی انہوں نے بڑی حد تک اسی طرح درویشانہ تربیت کی۔ میرؔ آگرہ میں لگ بھگ 1724ء میں پیدا ہوئے۔ میرؔ کے والدان کو ہمیشہ سمجھاتے تھے کہ

> "بیٹا عشق اختیار کر، اس کا عشق اختیار کر جس کا پرتو یہ ساری کائنات ہے۔ آگ سوز عشق ہے، پانی رفتار عشق ہے، خاک قرار عشق ہے، ہوا اضطرار عشق ہے۔ حیات عشق کی ہوشیاری ہے اور موت عشق کی مستی ہے"

غرض میرؔ نے لکھا ہے کہ میرے والد کامل فقیر تھے، وہ بہت کم آمیز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرؔ میں بھی خودداری اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ میرؔ کے والد کے ایک معتقد سید امان اللہ تھے جو میرؔ کے والد کی صحبت میں درویشی کے اعلیٰ مقام تک پہنچے تھے۔ سید امان اللہ نے میرؔ کی تربیت کی وہ میرؔ کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ میرؔ ان کو چچا کہتے تھے۔ ان کی تربیت بھی دیرپا نہ رہی۔ کم عمری میں ہی والد کا انتقال ہوگیا۔ والد نے قرض چھوڑا تھا جو کچھ پیسہ آیا وہ قرض کی نظر ہوگیا۔ بڑے بھائی

نے آنکھیں پھیر لیں۔ کم عمر میرؔ روزگار کی فکر میں سرگردان ہو گئے لیکن خود لکھتے ہیں۔

"جو لوگ والد کی زندگی میں میری خاک پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں
میں لگاتے تھے، اب انہوں نے یکبارگی آنکھیں چرالیں"

مجبور ہو کر میرؔ تلاش معاش میں دلی آئے لیکن یہاں بھی کچھ خاص آسانی نہ ہوئی، کہتے ہیں:

"ماموں سراج الدین علی ان آرزوؔ کا منت پذیر ہوا یعنی کچھ دن ان کے
پاس رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں جب میں کسی
قابل ہوا تو بھائی صاحب کا خط پہونچا (سوتیلے بھائی محمد حسن کا) کہ میر
تقی فتنہ روزگار ہے ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے۔ وہ عزیز
(سراج الدین علی خان) واقعی دنیا دار شخص تھا۔ اپنے بھانجے کے لکھنے
پر میری درپے ہو گیا، جب کبھی ملاقات ہوتی برا بھلا کہنا شروع کر دیتے
، اور طرح طرح کی تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے، میرے ساتھ ان کا
سلوک ایسا تھا جیسا کہ کسی دشمن سے ہوتا ہے۔ اگر اس دشمنی کی تفصیل
لکھوں تو ایک دفتر ہو جائے"

غرض میرؔ کو اس قدر رنج و تکلیف ہوئی کہ وہ دروازہ بند کر کے کمرے میں پڑے رہتے تھے، اس کی وجہ سے ان کو جنون ہو گیا۔ جب حالت سدھری تو دہلی میں نواب صمصام الدولہ جو ان کے والد کے عقیدت مندوں میں سے تھے میرؔ کو اپنی سرکار سے ایک روپیہ روزانہ مقرر کر دیا۔ لیکن نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور یہ روزینہ بھی بند ہو گیا۔ ایسی حالت میں بھی میرؔ کو علم سے اور شاعری سے شغف رہا خود لکھتے ہیں کہ میر جعفر نامی ایک صاحب سے ملاقات ہو گئی اور انہوں نے بڑی مہربانی اور لگن سے مجھے پڑھانا شروع کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد اچانک ان کے وطن عظیم آباد سے ایک خط آیا وہ ادھر چلے گئے دوبارہ نہ آئے۔ کچھ دنوں بعد امروہہ کے سید سعادت علی سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے ریختے کے شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ میرؔ نے جان توڑ کوشش کی اور ایسی

مشق بہم پہنچائی کہ شہر میں موزوں گویوں میں مستند سمجھے جانے لگے۔ ان کے شعر سارے شہر میں مشہور ہوگئے چھوٹے بڑے سب شوق سے پڑھتے تھے۔ میرؔ نے اپنے خالو سراج الدین علی خان آرزوؔ کی صحبت سے بھی فیض اٹھایا۔ بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

"میر نے بعض ترکیبیں اور الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جو ان سے قبل صرف خان آرزوؔ کے ہاں ملتے ہیں، مثلاً دریا سے لنگر دار، طفلان تہہ باز، بے ہیچ، سرنشین وغیرہ میرؔ فطری طور پر شاعر واقع ہوئے تھے اور ذوق شعر ان کی طبعیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غم عشق اور غم روزگار دونوں نے میرؔ کو اندروں بین اور کم آمیز بنا دیا تھا، اور ان دونوں رنگوں کا آمیزہ ان کی شاعری ہے۔ میرؔ ایسے زمانے میں دلی آئے تھے جب صحیح معنوں میں دستار سنبھالنی مشکل تھی، یعنی جینے کی کوشش میں جو تکلیف تھی سو تھی، عزت و آبرو بچالے جانا بھی نہایت مشکل تھا، خود فرماتے ہیں:

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے ☆ دونو ہاتھوں سے تھامیے دستار

5.2.2 چاروں طرف نفسانفسی کا عالم تھا، خودغرضی، غارت گری، پریشانی کا یہ عالم تھا کہ تاجوری اور نوحہ گری ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ بقول ڈاکٹر تاراچند

"سلطنت مغلیہ پر بری حد تک زوال آچکا تھا، بادشاہوں کے جمع کئے ہوئے خزانے خانہ جنگیوں میں خالی ہو چکے تھے، عہدے داروں کی تنخواہیں چڑھی رہتی تھیں۔ بادشاہوں کے بار بار بدلنے سے شاہی افسروں میں بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ وفاداری میں خلل پڑنے لگا تھا، ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک پورے حکمران طبقے کی اخلاقی حالت خراب ہوگئی تھی"

5.2.3 پہلے نادرشاہ کے حملے نے دہلی کو تباہ کیا۔ اس کے بعد اس کے قتل عام نے دلّی کو برباد کیا۔ دہلی کی ساری دولت جو کوئی ستر کڑوڑ تھی جس میں تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا، وہ لوٹ کر

ایران لے گیا۔ ابھی دہلی والوں نے سکون کی سانس بھی نہ لی تھی کہ احمد شاہ ابدالی کے حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور شہر دلی ایسا اجڑا کہ پھر دوبارہ بسایا نہ گیا۔ یہ حالات تھے جب میرؔ دلی آئے تھے۔ میرؔ بھی بہت پریشان رہے۔ کچھ دن رعایت خان کی مصاحبت میں رہے اس کے بعد نواب بہادر سرکار سے تعلق ہو گیا۔ لیکن نواب بہادر دھوکے سے قتل کر دئے گئے، اس کے بعد دیوان مہانارائن نے برے اشتیاق سے بلا بھیجا اور اس کی سرکار سے تعلق ہو گیا لیکن چند ہی ماہ میں یہ ساتھ بھی چھوٹ گیا، دو تین ماہ کے بعد راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے اپنے ساتھ لے گئے اور راجہ ناگرمل سے ملا دیا جنہوں نے میرؔ کی بڑی عزت کی اور میرؔ کو بہت دنوں تک آرام رہا۔

5.2.4 میرؔ کی زندگی لڑکپن ہی سے بڑی تکلیفات میں گزری، لکھنو جانے تک یہ سلسلہ نہ ٹوٹا، لڑکپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، باپ کے مرتے ہی بڑے بھائی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دوست احباب نے بے مروتی برتی، کم عمری ہی میں زندگی گذارنے کی فکر لگ گئی۔ جب آگرہ میں سہولت نہ ہوئی تو دلی جانا پڑا۔ لیکن اس وقت کی دلی چاروں طرف سے آفات کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ بادشاہ دست نگر، امیر مایوس اور پریشان چاروں طرف طوائف الملوکی اور ابتری کا دور دورہ۔ ایسی اور ان لگاتار آفتوں میں شاعر کس گنتی میں آتے۔ بڑے بڑے باکمالوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ سوائے خواجہ میر دردؔ کے جو نہایت عالی ہمتی سے دلی میں قدم جمائے رہے۔ میرؔ کو بھی مجبوراً دلی کو خیر باد کہنا پڑا۔

لکھنو کے نواب آصف الدولہ اہل کمال کی بڑی قدر کرتے تھے، لکھنو میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کا انتقال ہو چکا تھا، انہوں نے میرؔ کو لکھنو بلوا بھیجا، لکھنو کے سفر کے لئے زادراہ بھی روانہ کیا۔ اس طرح میرؔ ہمیشہ کے لئے دلی چھوڑ کر لکھنو آ گئے اور آخر یہیں انتقال کیا۔ میرؔ کے دلی چھوڑتے ہی دلی سونی ہو گئی، کیونکہ میر حسنؔ، میر سوزؔ، جرأتؔ وغیرہ سب نے دلی چھوڑ دی، اور لکھنو آ بسے۔ میرؔ نے لکھا ہے کہ نواب صاحب بڑی عزت سے پیش آئے اور اپنی ملازمت میں لے لیا۔ آصف الدولہ نے دو سو روپئے مہینہ مقرر کر دیا۔

5.2.5 اس زمانے کی تاریخ صرف خون ریزی فتنہ وفساد اور عیش وعشرت کی تاریخ نہیں ہے۔ یہ سماجی زوال کی تاریخ ہے، سماجی زوال تو آ گیا لیکن انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا، اس وقت کے اس مایوس کن ماحول میں بھی ایثار اور کرم، غیرت اور شجاعت کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ اس زمانے میں جب دلی تباہی و بربادی کی آندھیوں میں گھری ہوئی تھی، میرؔ نے اپنی آنکھوں سے تمام واقعات کو دیکھا، زخم کھائے تکلیفیں اٹھائیں، غم عشق اور غم دوراں کو مردانہ وار برداشت کیا لیکن زمانے کی بے رحمی کے آگے گردن نہیں جھکائی۔ ساری عمر کی ناکامیوں سے وہ سلیقہ پیدا کیا جو آج بھی حیرت میں ڈالنے والا ہے، ان کا غم انتہائی بلندیوں تک پہنچ گیا، اسی لئے ان کے غم میں ایک رکھ رکھاؤ ہے، ضبط وخود داری کا احساس اور مقابلہ کی ہمت وتوانائی ہے۔ ان کا غم روایتی یا مصنوعی نہیں بلکہ زندگی کی حقیقت ہے۔ ان کی شاعری ایسے حالات میں پروان چڑھی جب جاگیردارانہ نظام آخری ہچکیاں لے رہا تھا، دیہاتی معیشت روز بروز ختم ہوتی جارہی تھی۔ انگلستان نے اپنے قدم ہندوستان میں جامنے شروع کردئے تھے۔ صنعتی انقلاب یہاں بھی آہستہ آہستہ قائم ہورہا تھا۔ سرمایہ داری نے قدم جمانے شروع کردئے تھے۔ یہ ماحول تھا جب میر کی شاعری عروج پر تھی۔ میرؔ نے اس ماحول کو بڑے سلیقے سے غزلوں میں سمودیا، ان کے شعر نہیں تھے بلکہ دلی کے مرثیے تھے بقول خود:

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دے لوگوں کو☆ شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

میرؔ کی شاعری کی دھوم دلی سے لکھنو پہنچ چکی تھی، چنانچہ وہاں کے لوگوں نے ان کی بڑی قدر دانی کی۔ امیر سے لے کر غریب تک، بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب ان کے لئے آنکھیں بچھاتے تھے، ان کے آنے سے مشاعروں کی رونق بڑھ گئی، لوگ دور دور سے آتے تھے، کہ میرؔ کی زبان سے ان کا کلام سنیں، یہ مقبولیت اردو کے کسی اور شاعری کو میسر نہ ہوئی۔ اس وقت سے اب تک میرؔ کے کمال کا رعب لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے ان کو استاد مانا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

سوال ۱: میرؔ کی حیات اوپر روشنی ڈالئے۔

سوال ۲: میرؔ نے زندگی میں کن مشکلات کا سامنا کیا۔؟

جواب: 5.2 اور 5.2.4 اور 5.2.5 کے تحت دیکھئے:

5.2.6 میرؔ کی شاعری اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے اردو زبان میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، بلکہ بے مثال ہے، الفاظ کی بندش یعنی الفاظ کا حسب موقع باترتیب ہونا، خیال کی بندش یعنی شعر کے معنوں کا حسب موقع و باترتیب ہونا، خیال بندی سلسلہ خیال یا تصور، الفاظ کا صحیح استعمال خاص ترتیب وترکیب سے جس سے زبان میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے، اس کے ساتھ سادگی اور پیرایہ بیان عمدہ ہوتو شعر کا رتبہ بلند ہوجاتا ہے، میرؔ کی شاعری میں یہ باتیں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں تشبیہہ صفائے گفتگو فصاحت و بلاغت، سہل ممتنع، تجنیس وغیرہ کی تمام خصوصیات بڑے سلیقے سے استعمال ہوئی ہیں۔ میرؔ شاعری کو "شریف فن" خیال کرتے تھے، اس لئے علمی قابلیت، شاعرانہ سلیقے اور تہذیب الفاظ کو وہ ضروری قرار دیتے تھے، انہوں نے معنوں کی تہہ دری، تازہ الفاظ کی تلاش کو شعر کی شرط قرار دیا ہے۔ وہ فارسی کی اندھی تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے۔ زبان کے مقابلہ میں میر کی نظر بڑی وسیع اور گہری تھی، وہ کھرے کھوٹے کو صاف پہچانتے تھے، ان کی زبان میں سوز و گداز، جدت وتاثیر کی ایسی خوبیاں موجود ہیں جو اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن اخلاقی اور حکیمانہ مضامین بھی اسی رنگ میں نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جن پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔ میرؔ نے عشق کو تہذیب میں داخل کر کے زندگی اور عشق دونوں کا رتبہ بڑھا دیا ہے۔ ان کی غیرت، خودداری، تہذیب عشق اردو، شاعری کا بہترین سرمایہ ہے، عشق نے ان کی انانیت کو ختم کر دیا

تھا، یہ احساس عالمی بن گیا تھا اسی لئے کئی جگہ وہ لفظ "ہم" کو استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

۱ مست سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ☆ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

۲ ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے ☆ درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

۳ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ☆ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔

میرؔ پامال ہو یا بلند پرواز ہو وہ سادہ زندگی اور بلند خیالی کے قائل ہیں، زندگی کے لئے وہ صبر و استقلال اور اچھے اعمال کو ضروری سمجھتے ہیں مثلاً

۱ بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو ☆ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کے بہت یاد رہو

5.2.7 بچپن ہی سے میرؔ کو درویشوں کی صحبت نصیب ہوئی، اور ان کے والد بھی صوفی منش بزرگ تھے۔ سید امان اللہ جنہیں وہ چچا کہتے تھے، صوفیانہ طور رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے میرؔ کی پرورش کی اور تربیت بھی، والد نے خدا کا عشق اختیار کرنے کی تاکید کی تھی کہتے تھے بیٹا بے عشق زندگی وبال ہے، پھول کا بلبل بنو جو سدا بہار ہے، دوسری طرف میرؔ کو عشق مجازی میں ناکامی ہوئی، ان کا دل و دماغ نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو گیا، ایک طرف اپنی بڑائی کا احساس دوسری طرف ناکامی اور بے بسی کا احساس ان باتوں نے اور ایسے جذبات نے ان کی عشقیہ شاعری میں امرت کی بوندیں ٹپکا دیں، ہم کو اس لئے میرؔ کے ہاں ایک دردمند انسانیت کی فریاد اور احساس اور ایک خوددار خاموش شخص کا گریہ ملتا ہے۔ خود کہتے ہیں:

میرے سلیقے سے نبھی میری محبت میں ☆ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا ☆ دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

میرؔ فکر معاش سے آزاد نہیں تھے لیکن خوے گدایانہ ان میں نہیں تھی۔ وہ حرص و ہوا سے آزاد تھے، انہوں نے غیرت اور خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

۱ آگے کسی کو کیا کریں دست طمع دراز ☆ وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

اس طرح میرؔ کے کلام میں ہم کو حیرت انگیز جلوے نظر آتے ہین، ان کے الفاظ سادہ ہیں لیکن ان کے پیچھے زمانے کا طوفان چھپا ہوا ہے، معنوں کا ایک سمندر موجزن ہوتا ہے۔ اگر چہ میرؔ کے الفاظ نرم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا درد واثر اور جوش چھپا رہتا ہے، ان الفاظ کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دے جاتی ے، مولانا حالیؔ نے اس بات کو بڑے اچھے طریقے سے واضح کیا ہے:

"دنیا نے جتنے شاعر استاد مانے گئے ہیں ان کو استاد ماننا چاہئے، سوائے اللہ کے کلام کے کسی کا کلام اول سے آخر تک اعلیٰ درجے پر واقع نہیں ہوسکتا، شاعر کی معراج کمال یہ ہے کہ اس کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں حیرت انگیز جلوہ نظر آئے"

5.2.8 مولانا حالی نے مقدمہ دیوان میں ایک بہت ہی پر لطف لطیفہ لکھا ہے جس سے نہ صرف شعر کی خوبی بلکہ میرؔ کے کلام کی خصوصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں

"مولانا آزردہ کے مکان پر چند احباب جمع تھے جن میں مومنؔ اور شیفتہ بھی تھے، میرؔ کا یہ شعر پڑھا گیا"

اب کے جنون میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ☆ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس شعر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو خیال ہوا کہ اس قافیہ کو ہر شخص اپنے اپنے سلیقے اور فکر کے موافق باندھ کر دکھائے، سب قلم دوات اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے۔ اسی وقت ایک دوست وارد ہوئے، مولانا سے پوچھا حضرت کس فکر میں بیٹھے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا قل ھواللہ کا جواب لکھ رہا ہوں۔

مولانا حالیؔ نے اس شعر سے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:

ظاہر ہے جوش جنون میں گریباں اور دامن یا دونوں کا چاک کرنا نہایت متبذل اور پامال مضمون ہے، جس کو قدیم زمانے سے شعرا باندھتے آئے ہیں۔ ایسے چھیڑے ہوئے مضمون کو میرؔ نے باوجود غایت درجے سادگی کے ایک اچھوتے نرالے اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے، اس سے بہتر

اسلوب تصور میں نہیں آسکتا، اس اسلوب کی خوبی یہی ہے کہ سیدھا سادا ہے، نیچرل ہے اور اس کے باوجود انوکھا ہے۔

یہی خوبی میرؔ کے منتخب کلام میں پائی جاتی ہے، یوں تو میرؔ کے تمام نامور ہم عصروں کے کلام میں سادگی صفائی اور روزمرہ کی پابندی پائی جاتی ہے، لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی، جب تک کہ بیان میں تازگی، مطلب ادا کرنے میں شگفتگی اور خیال میں بلندی و جدت نہ ہو میر کے کلام میں یہ سب خوبیاں یک جا جمع ہیں اور پھر اس سے ساتھ درد و تاثیر خداداد ہے، اسی لئے وہ اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

5.2.9 میرؔ کے ہاں فکر احساس میں چھپا ہوا ہے، میرؔ نے اپنے کلام میں قلبی واردات کے ساتھ قتل خون، بستیوں کے اجڑنے کا بھی شمار کیا ہے، میر نے اپنے فن کو محدود نہیں کیا کسی لفظ کو استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا، کسی کیفیت کے اظہار کو نظر انداز نہیں کیا، میر کے کلام میں کئی رنگ ہیں۔ میر نے خارجی باتوں کو بھی داخلی سانچے میں ڈھال دیا ہے، میرؔ کی غزلیں گل و بلبل کے افسانے تک محدود نہیں ہیں بلکہ زمانے کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے دل اور دلی کے مرثیے اس طرح لکھے ہیں کہ الفاظ و علامات تصور کی نشانی معلوم نہیں ہوتے بلکہ داستان کا ٹکڑا معلوم ہوتے ہیں۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات ☆ کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

مصائب اور تھے پر دل کا جانا ☆ عجب ایک سانحہ سا ہوگیا ہے

میرؔ کے شعروں میں گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے، بقول محمد حسین آزاد "ایسا پاکیزہ بیان ہے جیسے باتیں کرتے ہیں"

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں نہ ایسی نہ سنئے گا ☆ پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

میرؔ کی غزلوں میں جو اشاراتی انداز ہے، اختصار ہے، نغمگی اور معنی کی گہرائی ہے، وہ سچی کیفیا ت کی ہو بہو تصویریں ہیں مثلاً:

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ☆ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے☆ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسی کا منھ☆ کل میرؔ کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

5.2.10 میر کے سلسلے میں سہل ممتنع کا تذکرہ سب نے کیا ہے، غالبؔ نے ایک خط میں سہل ممتنع کو یوں بیان کیا ہے کہ ایسا شعر جس کو پڑھ کر خیال ہو ایسا کہنا بہت آسان ہے لیکن جب کہنے کی کوشش کریں تو ناممکن ہو، میرؔ کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک یہ بات پائی جاتی ہے، میرؔ کے اشعار کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے، ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا☆ دیکھا اس بیماری دل نے اپنا کام تمام کیا

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو☆ شہر دلی میں ہے سب یاس نشانی اس کی

مرگ اک موت ماندگی کا وقفہ ہے☆ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

حالانکہ یہ عام بول چال کے پیرایہ میں کہے ہوئے شعر ہیں لیکن ان کے پیچھے ایک جہاں معنی پوشیدہ ہیں، فراق گورکھپوری نے میرؔ کو "مصور غم" کا لقب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں میرؔ ہر جذبے کو شخصی دائرے سے پھیلا کر کائناتی وسعت دے دیتے ہیں۔

آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "میر کی سادگی میں لاوہ ہے، جو تن تک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے" میرؔ کے ہاں عشق کا تصور ایک دھندلا دیا نہیں ہے بلکہ شعلہ بے باک ہے جس کی آنچ ہڈیوں تک کو جلا دیتی ہے۔ میرؔ کا غم " آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی ہے"؛ مثلاً

تو ہے بے چارا گدا میر تیرا کیا مذکور☆ مل گئے خاک میں یاں صاف افسر کتنے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے☆ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میرؔ کے ہاں الفاظ خیال کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو☆ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہ شعر نہایت سادہ ہے، اس سے زیادہ آسان اور معمولی الفاظ کیا ہوں گے لیکن انداز بیان درد سے بھرا ہوا ایک ایک لفظ سے حسرت ٹپکتی ہے۔ اردو کیا کسی اور زبان میں بھی اس پائے کا شعر مشکل سے ملے گا۔ ندرت اور انوکھے پن اور بیان کی سادگی سے میرؔ کو بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ پرانے مضمون کو نیا لباس پہنانے کیلئے نادر ہی یہ بیان اختیار کرتے ہیں یہ اعلیٰ شاعری کی علامت ہے مثلاً

آنکھوں سے پوچھا حال دل کا ☆ ایک بوند ٹپک پڑی لہو کی

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

سوال ۱: میرؔ کے کلام سے سہل ممتنع کی مثالیں دیجئے۔

جواب: 5.2.10 کے تحت دیکھئے:

5.2.11 نواب سید امداد امام اثرؔ نے لکھا ہے کہ

"میرؔ کی غزل سرائی میں کبھی واردات قلب ذہنی کیفیت سے باہر نہیں جاتی تبھی ان کے کلام میں سوز و گداز نشتریت، شیرینی اور رنگینی وغیرہ ہے۔ ان کی لمبی بحروں والی غزلوں میں بھی ترنم ہے۔"

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے ☆ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ☆ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اخلاقی اور حکیمانہ باتیں اور بڑے بڑے نکات ایسی ہی بے تکلفی سے اور اسی انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔

سرسری تم جہاں سے گذرے ہو ☆ ورنہ ہر جا جہاں دیگر تھا

اڑنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ ☆ شائستہ پر یدن بازو میں پر کہاں ہے

5.2.12 میرؔ کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر جاتے ہیں، علامہ طبا طبائی نے لکھا ہے کہ چند الفاظ میں کثیر معنی ادا کرنا ایک ایجاز ہے، مثلاً

؎ صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی ☆ کیا پتنگے نے التماس کیا

؎ مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ ☆ کیا دوانے نے موت پائی ہے

میرؔ نے ضرب الامثال اور محاوروں کو بڑے سلیقے سے نظم کیا ہے، مثلاً

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ ☆ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے ☆ دونو ہاتھوں سے تھامیے دستار

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں "میرؔ صرف اردو اور مخصوص زبان سے کام لیتے ہیں دوسرے ممتاز شعراء کی جو مخصوص زبان ہے اس میں اتنا "اردو پن" نہیں ہوتا۔ عشق بن یہ ادب نہیں آتا۔ میرؔ داخل ترین محسوسات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں مصوری ہے، یہی ان کی عالم گیر مقبولیت کا راز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ میرؔ نہیں بول رہے ہیں بلکہ ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی ہے۔ میرؔ کے لہجے کی نرمی دنیا کے بہم کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ سوز و ساز کو ایک مرکز پہ لے آتے ہیں۔

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے ☆ خون ہوا، دل باغ ہوا، پھر درد ہوا، پھر غم ہے اب

فراق گورکھپوری کہتے ہیں میرؔ شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے، میرؔ نے اس دنیا کو عالم تصویر کہا ہے، " گویا یہ کائنات حسن تو رکھتی ہے مگر اس کا حسن صرف علامت ہے"۔ ان کے کلام میں بے باکی وصاف گوئی، دنیا کے عبرتناک مرقعے، تصوف واردات قلب، آلام و مصائب کے تلخ تجربے، تخیل کی بلندی، تلمیحات وغیرہ بڑے سادگی سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً

؎ یہ جو چشم پر آب ہیں دونو ☆ ایک خانہ خراب ہیں دونو

؎ میں جو بولا کہا کہ یہ آواز ☆ اسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ کا انتقال 1810ء میں لکھنو میں ہوا، اور وہیں دفن ہوئے۔ انہوں نے 90 برس کی عمر پائی۔

5.3 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپ کو میر تقی میرؔ کی حیات اور شاعری اور ان کی شاعری کی متعدد خصوصیات سے واقف کرایا، اغراض ومقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ میرؔ کی شاعری ان کے نظریات انکے افکار کیا ہیں۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، امید ہے کہ آپ ان سے ضرور استفادہ کریں گے۔

5.4 نمونہ امتحانی سوالات :

1۔ میرؔ کی حیات اور شاعری کا جائزہ لیجئے۔

2۔ میرؔ کی شاعری غم جاناں اور غم روزگار کا سنگم ہے؟ تبصرہ کیجئے۔

3۔ میرؔ کی شاعری کی خوبیوں پر ایک جامع نوٹ لکھئے۔

4۔ فراق نے میرؔ کو "مصور غم" کیوں کہا وضاحت کیجئے؟

5.5 فرہنگ:

لفظ	معنی	لفظ	معنی
خودنوشت	خود لکھی ہوئی	معاش	گذراوقات
توقیر	عزت	اضطرار	بے قراری
سوز	گرمی	پرتو	سایہ
روزگار	زمانہ، نوکری	مستند	مانا ہوا

کم آمیز	تنہائی پسند	خانہ جنگی	آپسی لڑائی
اشتیاق	چاہت	بے مروتی	بے رخی
دست نگر	محتاج	انفرادی	شخصی
غم دوراں	روزی روٹی کا غم	وسیع	پھیلی ہوئی
امرت	آب حیات	گریہ	رونا، غم
اسلوب	طرز بیان	ہم عصر	ساتھی

5.6 سفارش کردہ کتابیں :

1۔	میر اور مثنویات میر	پروفیسر وہاب اشرفی
2۔	کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید	طارق سعید
3۔	نقد میر	ڈاکٹر سید عبداللہ
4۔	انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق
5۔	پیغمبران سخن	علی سردار جعفری
6۔	شعر شور انگیز	شمس الرحمٰن فاروقی

پروفیسر افروز احمد

وظیفہ یاب ، جے یس یس کالج،

اوٹی روڈ، میسور

اکائی ۔٦ :(i) میرؔ کی منتخب پانچ غزلیں اور تشریح :

ساخت :

6.0 اغراض ومقاصد

6.1 تمہید

6.2 میر کی غزل گوئی

6.3 میر کی منتخب پانچ غزلیں

غزل نمبر۱: متن اور اس کی تشریح

6.4 غزل نمبر۲: متن اور اس کی تشریح

6.5 غزل نمبر۳: متن اور اس کی تشریح

6.6 غزل نمبر۴: متن اور اس کی تشریح

6.7 غزل نمبر۵: متن اور اس کی تشریح

6.8 خلاصہ

6.9 نمونہ امتحانی سوالات

6.10 فرہنگ

6.11 سفارش کردہ کتابیں

6.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ میرؔ کی غزل گوئی سے متعلق جان سکیں، ان کی غزل گوئی کی خوبیوں کو پہچان سکیں، ساتھ ہی میرؔ کی شاعری کی خوبیوں سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

6.1 تمہید :

اس اکائی میں میرؔ کی غزل گوئی کی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی شاعری کی گہرائی اور ان کی غزلوں میں خارجی واقعات اثر اور اس اثر سے زمانے کی حالت پر پڑنے والی روشنی سے متعلق بھی بحث کی جائیگی، امید کی جاتی ہے کہ اس سے آپ میرؔ کی شاعری کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے، اور نصاب میں شامل غزلوں کی شرح کرسکیں گے۔

6.2 میرؔ کی غزل گوئی

غزل کے معنی ہیں عورتوں سے بات چیت کرنا، لیکن موجودہ دور میں اس میں ہر قسم کے مضمون باندھے جاتے ہیں۔ غزل کا ہر شعر جدا جدا معنی رکھتا ہے، لیکن مسلسل غزلیں بھی لکھی گئی ہیں، غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ فنی نکتہ نظر سے جو جاذبیت اور جامعیت غزل کے حصے میں آئی ہے وہ دوسری اصناف سخن میں نہیں ہے۔ غزل کا فن گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ اس کا لہجہ خوشگوار، زبان شیرین، معنوں میں گہرائی ہوتی ے۔ ان سب کو ملا کر تغزل کہا جاتا ہے، آیئے اب ہم میرؔ کی غزل گوئی سے متعلق کچھ باتیں جان لیں، میرؔ دنیائے غزل کے شہنشاہ ہیں، ان کی غزل گوئی کی دھوم ان کی زندگی ہی میں تھی، ان کی غزل گوئی کی استادی کو تمام شاعروں نے مان لیا ہے۔ مثلاً غالبؔ کہتے ہیں:

؎ ریختے کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ ☆ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ کے ہم عصر شاعر ذوقؔ نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہتے ہیں:

؎ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ☆ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ناسخ نے کہا ہے: آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

حسرت موہانی نے کہا: میر کا شیوہء گفتار کہاں سے لاؤں

6.2.1 میرؔ کی غزلوں میں ہم کو غم جاناں اور غم روزگار کا آمیزہ ملتا ہے، ان کی زندگی کے حالات شاہد ہیں کہ ان کو غم عشق سے بھی سابقہ پڑا اور معاش کے غم سے بھی۔ ان کو عشق مجازی میں بھی ناکامی ہوئی، اور دنیاوی زندگی میں بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن وہ غیرت منداور خوددار شخص تھے، اس لئے انہوں نے زمانے کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے بلکہ دونوں غموں کو سلیقے کے ساتھ برداشت کیا کہتے ہیں:

؎ مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کے صاحب ہم نے ☆ درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا:

6.2.2 میرؔ کی غزلیں دلّی کے مصور اوراق ہیں جن میں اس زمانے کی دلی کی کیفیت کو بیان کر دیا ہے میرؔ کی زبان سادہ اور صاف ہوتی ہے، لیکن ان الفاظ کے پیچھے معنوں کا سمندر موجیں مار رہا ہوتا ہے۔ الفاظ کی بندش، خیال کی بندش، روانی، اختصار وغیرہ سے وہ ایسی شیریں اور پر اثر غزلیں لکھتے ہیں کہ اشعار بلا غور و فکر بھی ذہن میں سما جاتے ہیں، اور دل میں نشتر بن کر اتر جاتے ہیں۔ تشبیہہ تراشنے میں میرؔ کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ شدت غم کا احساس ان کی غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ غم صرف ذاتی غم نہیں ہوتا بلکہ یہ کائناتی غم ہوتا ہے۔ سوز و گداز، درد و اثر ان کے کلام کا خاص حصہ ہے۔ میرؔ نے اپنی غزلوں میں خارجی حالات کو بھی داخلی بنا لیا ہے، میرؔ کی غزلیں صرف گل و بلبل کا افسانہ نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے زمانے کی ترجمان ہیں۔ مولوی عبدالباری آسی نے میرؔ کی غزل گوئی کی خوبیاں گناتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "ان کے کلام میں بے باکی و صفائی، دنیا کے عبرت ناک مرقعے، تصوف واردات قلب، آلام و مصائب کے تلخ تجربے، تخیل کی بلندی، دلنشین تلمیحات، تشبیہہ کی ندرت، کنایہ، رمز، اشارے وغیرہ موجود ہیں۔"

6.2.3 میرؔ کی غزلوں میں اشاراتی انداز، اختصار اور غنائیت پائی جاتی ہے، میرؔ کی غزلوں کو پڑھنے سے ان کے عشق کی ساری داستان سامنے آجاتی ہے۔ یہاں دلگی دل کی لگی معلوم ہونے لگتی ہے۔ غزل میں خارجیت استعمال کی جائے تو بیان میں داخلی احوال کو پیش کرنے میں یہ رکاوٹ بنتی ہے، جیسے خط و خال، عارض، زلف وغیرہ لیکن میرؔ بڑی صفائی سے اس کو داخلی کیفیت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ مثلاً

؎ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ☆ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

؎ ناز کی اس کے لب کی کیا کہیئے ☆ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

6.2.4 میرؔ نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کی ان پراسرار حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے دل سے حیات اور کائنات میں اجالا ہے، ان کی غزلوں میں ایک دلربا اصلیت ہے، ان کی عاشقانہ سیرت میں ان کے خاندان کی تہذیبی اور معاشرتی روایات کو بڑا دخل ہے، مثلاً:

؎ پاس ناموس عشق تھا ورنہ ☆ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میرؔ کی غزلوں میں احساس خارجی اور خیالی نہیں بلکہ حقیقی اور اصلی ہے، مثلاً

؎ مرے سلیقے سے میری نبھی میری محبت میں ☆ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا۔

6.2.5 میرؔ کی غزلوں میں حکیمانہ، فلسفیانہ، اور صوفیانہ، خیالات بھی ہیں، انہوں نے کبھی انسان کی عظمت کو نظر انداز نہیں کیا نہ ہی تہذیب کو کبھی فراموش کیا کہتے ہیں:

؎ مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں ☆ تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

؎ سب پہ جس بار نے گرانی کی ☆ اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

میرؔ نے آرام عشق اور آرام روزگار پر فتح پالی تھی، ان کو دل پر خون کی ایک گلابی سے جینے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ ندر بیان اور تازگی ءخیال میرؔ کے ہاں کثرت سے ملتے ہیں، وہ نہایت معمولی خیال کو بھی بڑے اچھوتے اور نرالے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

؎ اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ☆ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

تکرار الفاظ سے بھی میرؔ غزلوں میں نشتریت اور اثر پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

؎ پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے ☆ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لمبی بحروں میں بھی وہ روانی، شیرینی، اور اثر پیدا کرتے ہیں، مثلاً

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ☆ دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

چھوٹی بحروں میں بھی بجلیاں بھر دی ہیں مثلاً

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ☆ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جذبات کی ایسی تصویر کشی کرنا کہ سننے والے پر وہی اثر ڈالے جو شاعر خود محسوس کر رہا ہے، صداقت کہلاتا ہے، میر نے کہا ہے:

؎ میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز ☆ اسی خانہ خراب کی سی ہے

کم سے کم الفاظ میں اپنے مطلب کو پورا ادا کرنا بلاغت کی انتہا ہے، اس کو ایجاز کہتے ہیں، میر کے پاس اسکی مثال ملاحظہ کیجئے، کہتے ہیں:

؎ کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی ☆ دھوم ہے پھر بہار آنے کی

؎ مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر ☆ کیا دوانے نے موت پائی ہے

میر کے اشعار میں حیرت انگیز حد تک عام بول چال یا نثر کی نحوی ترتیب برقرار رہتی ہے، مثلاً

؎ سخت کافر تھا جس نے میر ☆ مذہب عشق اختیار کیا

محاورے اور ضرب الامثال کو بڑے سلیقے سے نظم کرتے ہیں، مثلاً

؎ اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر ☆ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جوابات :

سوال ۱: میر کی غزل گوئی کی خصوصیات رقم کیجئے۔

سوال ۲: میر کی غزل سے سہل ممتنع کی چند مثالیں دیجئے۔

جواب کے لئے 6.2 سے 6.2.5 کے تحت دیکھئے۔

6.3 پہلی غزل کا متن اور اس کی ترشیح :

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے
ناز کی اس کے لب کی کیا کہیئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں　　حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز　　اسی خانہ خراب کی سی ہے
میؔر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

6.3.0 ہستی اپنی حباب کی سی ہے۔۔۔

یہ شعر رواں ہے، اس کے الفاظ نہایت سادہ اور صاف ہیں۔ اس کو پڑھنے میں کہیں رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی، بات بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے گہرائی ہے، میؔر نے اپنی زندگی میں دلّی اُجڑتے دیکھا اور اس کی بے ثباتی انکے دل میں گھر کر گئی، اس بے ثباتی کو انہوں نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے، کہتے ہیں انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں یہ ایک پانی کے بلبلے کے مانند ہے نہ جانے کب بلبلے کی طرح یہ اچانک پھوٹ کر ختم ہوجائے۔ اس دنیا کی رونق بھی ایک دھوکا اور فریب ہے یہاں کی چہل پہل جس میں انسان کھو جاتا ہے، پہچانتا نہیں کہ یہ سب چندروزہ ہے، غالبؔ نے بھی یہی کہا ہے:

؎ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ☆ عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔

6.3.2 ناز کی اس کے لب کی کیا کہیئے:

میؔر کے بہتّر (۷۲) نشتر مشہور ہیں ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔ میؔر اپنی اچھوتی تشبیہوں سے شعر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ اس شعر میں میؔر نے محبوب کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ ہونٹوں کی خوبصورتی اور نزاکت کے لئے اس سے بہتر تشبیہہ کا تصور ناممکن ہے۔ کہتے ہیں میرے محبوب کے ہونٹوں کی نزاکت کیا بیان کروں وہ تو گلاب کی پنکھڑی کے مانند نرم و نازک ہیں۔ دونوں میں کھلنے کا حسن بھی ہے اور خوبصورتی بھی۔

6.3.3 بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں۔۔۔

میرؔ نے اس شعر کے حسن کو بار بار کی تکرار سے بڑھا دیا ہے، ان الفاظ سے پریشانی کی کیفیت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، نہایت رواں اور سلیس الفاظ ہیں لیکن بڑا ہی پر اثر شعر ہے۔ کہتے ہس، میری پریشانی کا تم اس سے اندازہ لگاؤ کہ مجھے کامیابی کی امید نہیں پھر بھی محبوب کے دروازے پر بار بار جاتا ہوں، اور واپس لوٹ آتا ہوں، (کسی حاجت مند کی پریشانی کی حالت بھی ہوسکتی ہے)

6.3.4 میں جو بولا کہا کہ یہ آواز

اس شعر میں میرؔ نے بات چیت کے انداز کو اپنایا ہے، میرؔ اپنے کلام میں محاوروں کو بڑی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ شعر اس کی مثال ہے "خانہ خراب" کو استعمال کرنے کے ڈھنگ میں معشوق کی نخوت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہتے ہیں، میں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ محبوب نے فوراً کہا یہ خانہ خراب دوبارہ آگیا ہے، یہ اسی کی آواز ہے۔

6.3.5 میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں

میرؔ کے بہتر نشتروں میں سے ایک ہے، میرؔ رمز و کنایہ سے بڑا اثر پیدا کرتے ہیں، اس شعر میں میرؔ نے محبوب کی ادھ کھلی آنکھوں کو شراب کی مستی سے کنایہ کیا ہے۔ میرے محبوب کی ادھ کھلی آنکھوں کو دیکھ کر شراب کی مستی کا تصور آجاتا ہے۔

6.4 غزل ۲ : کا متن اور اس کی تشریح:

میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی — اللہ اللہ رے طبعیت کی روانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنی وہ پراگندہ مزاج — اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
مینھ تو بوچھاڑ کا دیکھا ہے برستے تم نے — اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا — پر ملی خاک میں سب سحر بیانی اس کی
اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرور خوبی — منتیں اس نے بہت کیں پر نہ مانی اس کی

سرگذشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا　　سوگئے تم نہ سنی ہائے کہانی اس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دئے لوگوں کو　　شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہی　　درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی
اب گئے اس کے جو افسوس نہیں کچھ حاصل　　حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

6.4.1 تشریح : شعر۱: میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی:

میرؔ کا یہ شعر سادگی اور روانی کی اچھی مثال ہے، انہوں نے خود اپنے کلام کی روانی کی تعریف کی ہے، اپنے کلام کو بہتے ہوئے دریا کی روانی سے تشبیہہ دی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں میرے شعر دریا کے مانند رواں ہیں زبان کی صفائی اور سلاست ان مین کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن اس کا لطف اس وقت آئے گا جب ان اشعار کو خود میر کی زبان سے سنیں۔

6.4.2 شعر۲: ایک ہے عہد میں اپنی وہ پراگندہ مزاج

میرؔ نے اس شعر میں اپنی نازک مزاجی کو بیان کیا ہے، دنیا کی تلخیوں کو سہتے سہتے، وہ بڑے حساس ہوگئے تھے، اور کسی کی کم پرواہ کرتے تھے۔ ان کو خود اپنی بڑائی کا احساس تھا، وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ان کی زندگی ہی میں بہت سوں نے ان کا لوہا مان لیا تھا، کہتے ہیں میرؔ اپنے وقت کا پریشان مزاج والا ہے، لیکن اس نے شاعری کو کمال بلندی پر پہنچایا ہے، اور اس کی نظروں میں اپنے سوا کوئی صاحب کمال نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک مشہور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کسی نے میرؔ سے پوچھا دلی میں کتنے شاعر رہتے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا دو، کونسے؟ کہا میںؔ اور سوداؔ۔ پوچھنے والے نے کہا میر دردؔ بھی تو ہیں تو میرؔ نے جواب دیا چلئے ڈھائی مان لیجئے۔

6.4.3 شعر۳: مینھ تو بوچھاڑ کا دیکھا ہے برستے تم نے

میرؔ کو لڑکپن ہی سے غموں اور پریشانیوں نے گھیر لیا تھا، اپنے بیگانے بن گئے تھے، زندگی کے لالے پڑ گئے تھے، دہلی کی تباہی بار بار دیکھی، اس کے علاوہ جوانی میں عشق میں ناکامی نے دل کو درد وغم سے بھر دیا اس لئے ساری زندگی رنج وغم میں گذاری اسی بات کو وہ مبالغہ آمیز انداز میں کہتے ہیں، جس طرح مینھ لگا تار برستا رہتا ہے، اسی طرح میرؔ ساری عمر آنکھوں سے آنسو بہاتا رہا۔

6.4.4 شعر۴: بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا

اپنی شاعری کو جادو سے تشبیہہ دی ہے، یہ سچ بھی ہے، انکا کلام اس زمانے میں زبان کی صفائی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے جادو سے کسی طرح کم نہ تھا، کہتے ہیں کہ میری شاعری جادو سے کسی طرح کم نہ تھی، لیکن افسوس یہ جادو بیانی زمانے کی بدحالی کی نظر ہوگئی یہاں میرؔ نے خاکساری سے کام لیا ہے ورنہ ان کی شاعری کی اس زمانے میں بھی بڑی دھوم تھی۔

6.4.5 شعر۵: اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرورِ خوبی

معشوق کی جفا کاری اور ستم گری کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے، میرؔ کی محبت تہذیب کے دائرہ سے کبھی باہر نہ گئی دیکھئے معشوق کے غرور کو خوبی والا غرور کہتے ہیں۔ کہتے ہیں میں نے نہایت عاجزی سے کام لیا، تمہاری بہت منتیں کیں، لیکن اپنے حسن کے غرور میں تم نے سنگ دلی کا مظاہرہ کیا اور ہماری التجا کو قبول نہ کیا۔

6.4.6 شعر۶: سرگذشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا

اس شعر میں لفظ "سرگذشت" استعارہ ہے، میرؔ کی اور دہلی کی ساری کیفیت کا اسی میں میرؔ نے گویا اپنی زندگی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ انہوں نے لفظ "سرگذشت" میں دلی کے بار بار اجڑنے، شریفوں اور نجیبوں کی بے کسی و بے بسی، عوام کی بدحالی، خود ان کی زندگی کے رنج والم سب کا اظہار ہے۔ وہ سراپا رنج والم بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک سے اپنا دکھڑا سناتے ہیں۔ لفظ "اندوہ" اور "ہائے" اس شعر کی جان ہیں جن سے درد واثر دل میں اتر جاتا ہے۔ کہتے ہیں، میرؔ کس دل گدازی سے

کل شب اپنی داستان غم سنا رہا تھا، ہائے افسوس کہ تم نے اس کی کہانی نہیں سنی اور بے خبر سو گئے۔

6.4.7 شعر۷: مرثیے دل کے کئی کہہ کے دئے لوگوں کو

یہ شعر پر اثر اور زوردار ہے، میرؔ نے غم جاناں اور غم رواں دونوں کو برداشت کرتے کرتے اس کو یکجا کر دیا تھا۔ یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ غم جاناں کونسا ہے اور غم روزگار کونسا۔ یہ رنج و غم ان کے دل کی گہرائیوں تک اتر گیا تھا۔ اسی کو وہ "دل کے مرثیہ" کہتے ہیں۔ اس کو شعر میں نگینہ کی طرح بٹھایا ہے کہتے ہیں میرؔ کے رنج والم کو کیا پوچھتے ہو اس کا شعر ایک دل کا مرثیہ ہے اور یہ تمام کے تمام دلی والوں کے پاس نشانی کے طور پر موجود ہیں۔

6.4.8 شعر۸: آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے۔۔۔

بڑے پر اثر انداز بیان میں میرؔ کہتے ہیں میری جوانی کیا تھی ایک آبلہ کے مانند تھی ذرا سی ٹھیس لگنے سے یہ آبلہ پھوٹ کر ختم ہو گیا۔ میرؔ نے اپنی جوانی کو آبلہ سے کنایہ کیا ہے۔ ساری جوانی رنگ الم سہتے سہتے طبعیت اتنی حساس ہو گئی تھی کہ ذرا سی چوٹ لگتے ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔

6.4.9 شعر۹: اب گئے اس کے جو افسوس نہیں کچھ حاصل

میر اس دنیا سے رخصت ہو گیا لوگ اب کف افسوس مل رہے۔ اس کے جیتے جی دنیا والوں نے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا۔ اس کے کمال کی کوئی قدر نہ کی۔ اب افسوس کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

6.5 غزل ۳ کا متن اور اسکی تشریح:

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے — روش آب رواں پھیلے پھرا کرتے تھے
غیرت عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو — تھوڑی آزردگی میں ترک وفا کرتے تھے
دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع — لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے
جب تک شرم رہی مانع شوخی اس کی — تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے
مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ — دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
اب تو بے تابیٔ دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا — آگے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے
اٹھ گئے پر مرے تکئے کو کہیں گے یاں میرؔ — درد دل بیٹھے کہانی سی سنا کرتے تھے

6.5.1 شعر۱: باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے۔۔

میرؔ اس شعر میں ماضی کو یاد کرتے ہیں اور اس زمانے کی دلی والوں کا ذکر کرتے ہیں جب دلی ابھی آباد تھی وہاں کے لوگ خوش خوش زندگی گذارا کرتے تھے، اور اس دور کا ذکر کر رہے ہیں جب کہ ابھی وہ بلائے عشق میں مبتلا نہ ہوئے تھے، کہتے ہیں ایک زمانہ تھا ہم بھی نہایت خوشی سے باغ و چمن کی سیر کو جایا کرتے تھے، اور نہر کے کنارے روش پر بے فکری سے گھومتے پھرتے تھے، نہایت مگن اور مسرت سے ٹہلتے تھے۔

6.5.2 شعر۲: غیرت عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو

میرؔ نے اس شعر میں جذبات عشق کی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جب ابھی ابتداء تھی بقول میرؔ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا والا معاملہ تھا، کہتے ہیں کہ ابتداء میں عشق ہم کو بڑی بری بلا معلوم ہوتا تھا، اور اگر معشوق کے ساتھ تھوڑی ناچاقی بھی ہو جاتی تو ہم اس کے جذبہ وفا کو کچل دیتے تھے۔

6.5.3 شعر۳: دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع

عشق میں غم کو برداشت کرتے کرتے ان کی محبت میں ایک صبر ایک ضبط و استقلال پیدا ہو گیا

تھا۔ان کی محبت کو ایک سلیقہ آ گیا تھا، اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس عشق میں ہم کو صبر وضبط آ گیا، ایک طرح کی تسلی آ گئی تھی، لیکن لوگ ہم کو دیوانہ سمجھ کر ہماری ہمدردی میں ہمارا علاج کراتے رہتے تھے، حالانکہ اس بیماری کا کوئی علاج نہ تھا۔

6.5.4 شعر۴: جب تلک شرم رہی مانع شوخی اس کی

اس شعر میں لفظ "تلک" آیا ہے وہ اب متروک ہے، اس کی جگہ "تک" استعمال کرتے ہیں۔ میرؔ کہتے ہیں ہمارا محبوب بڑا شرمیلا تھا، اور شرم کی وجہ سے اس میں شوخی وشرارت نہیں تھی، ہم اس کو دیکھنے کے لئے ترستے رہتے تھے، لیکن اس کی عزت کی خاطر ہم باوجود تڑپ کے اس سے دور دور رہا کرتے تھے۔

6.5.5 شعر۵: مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ

اس شعر میں میرؔ نے صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، نماز، روزہ، یہ سب ظاہری عبادتیں ہیں، یہ بھی ضروری ہیں لیکن جو فرد اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو اللہ کے رنگ میں خود کو رنگ لینا چاہئے۔ یہ بات بڑی ریاضتوں اور محنت سے حاصل ہوتی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں ہم جب اللہ کی صحیح راہ سے ناواقف تھے تو صرف مسجد اور مندر ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے، اور وہاں لمبی لمبی نمازیں پڑھتے وظیفے پڑھتے، لیکن اصل عبادت تو اخلاص دل کی پاکی اور سختی کے ساتھ اپنے آپ کو حقوق العباد وحقوق اللہ کی سچی عبادتوں میں لگانا تھا۔ جان مال اولاد سب سے بڑھ کر اللہ کی محبت کو دل میں جگانا تھا تب کہیں جا کر ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچتے: بقول میرؔ

؎ عام ہے یار کی تجلی میرؔ خاص موسیٰ وہ کوہ طور نہیں

6.5.6 شعر۶: اب بے تابیٔ دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا

میرؔ کہتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ ہم عشق میں ہر قسم کا رنج وغم برداشت کرتے تھے، دور صبر وضبط کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، لیکن نہ جانے اس دل کو اب کیا ہو گیا ہے، کہ اس کی بے چینی اور تڑپ نے ہماری کمر توڑ دی ہے اور ہم بے بس ولاچار ہو گئے ہیں۔

6.5.7 شعر ۷: اٹھ گئے پر مرے تکئے کو کہیں گے یاں میر:

میرؔ کہتے ہیں میرے مرنے کے بعد لوگ میری قبر پر آئیں گے، اور مجھے یاد کریں گے، میری صحبت کو یاد کر کے کہیں گے، کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں بیٹھ کر میرؔ اپنی درد بھری کہانی سنایا کرتے تھے، تھی تو وہ کہانی سی لیکن اس میں سارے زمانے کے درد والم چھپے ہوئے تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

سوال: ذیل سے کسی دو شعر کی تشریح کیجئے:

(۱) میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی ☆ اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

(۲) مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ ☆ دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے۔

6.4.1.0(i) اور 6.5.5(v) کے تحت دیکھئے:

6.6 غزل ٤ کا متن اور اس کی تشریح :

داد فریاد جا بجا کریئے شاید اس کے دل میں جا کریئے

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت گالیاں کھایئے دعا کریئے

کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو کیوں کر اظہار مدعا کریئے

راہ تکنے کو بھی نہایت ہے منتظر کب تلک رہا کریئے

ہستی موہوم دیک سر و گردن سینکڑوں کیوں کہ حق ادا کریئے

وہ نہیں سر گذشت سنتا میرؔ یوں کہانی سی کیا کہا کریئے

مترتّب ہو نفع جو کچھ بھی دل کی بیماری کی دوا کریئے

6.6.1 شعر۱: دادفریاد جابجا کریئے

اس شعر میں میرؔ نے محاورے کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے، اس میں عاشق کی آرزو کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے، کہتے ہیں ہر گلی کوچے میں اس کے سامنے فریاد کرو گڑگڑاؤ، آنسو بہاؤ، شاید اس طرح اس سنگ دل کے دل میں تمہارے لئے جگہ پیدا ہو جائے۔

6.6.2 شعر۲: دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت

میرؔ کہتے ہیں ہمارا معشوق نہایت سنگ دل ہے اس کا ہمارا رشتہ محبت و آشنائی کا نہیں بلکہ سب وستم کا ہے۔ ہم ااس کی محفل میں گالیاں کھا کر بھی جمے رہتے ہیں، اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دیتے رہتے ہیں، اب معلوم نہیں کب تک ہماری اس کی دوستی باقی رہے گی۔

6.6.3 شعر۳: کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو

میرؔ کہتے ہیں بات بات پر ہمارا معشوق ہمیں ٹوکتا ہے، ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں، اور وہ اس بات کو نہ کہنے کی بات کرنے لگتا ہے، ہم اپنے دل کی بات شروع ہی کرتے ہیں کہ وہ منع کر دیتا ہے، ایسے ظالم وستم گر کے سامنے ہم اپنے دل کی بات کیسے بتائیں۔

6.6.4 شعر۴: راہ تکنے کو بھی نہایت ہے

میرؔ کہتے ہیں میں معشوق کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک گیا، آخر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اس طرح کب تک انتظار کیا جائے، شاید اسی انتظار میں ساری عمر کٹ جائے۔

6.6.5 شعر۵: ہستی موہوم دیک سر و گردن

ہماری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور وہ بھی صرف ایک بار ملی ہے، معشوق سینکڑوں ہیں آخر کس کس کا حق ہم ادا کر سکتے ہیں۔

6.6.6 شعر۶: وہ نہیں سرگذشت سنتا میرؔ

وہ ہماری دلی واردات اور مصیبتوں کا احوال سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس پر ہمارے درد و تکلیف کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہم جب بھی اپنی سرگذشت سناتے ہیں، وہ ایسے سنتا ہے گویا کوئی کہانی

سن رہا ہو۔ یوں بات کرنے سے کیا فائدہ۔

6.6.7 شعر ۷: مترتب ہو نفع جو کچھ بھی

ہمارا محبوب بیمار رہتا ہے اسکی بیماری کا کچھ تو علاج ہوگا اور شاید کچھ تو افاقہ (فائدہ) ہوگا، جو کچھ بھی ہو کچھ تو ترتیب کیجئے۔ مطلب یہ کہ عشق میں فائدہ نقصان کچھ کم ہی ترتیب پاتا ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کہ محبوب اپنے معشوق سے ملنے کی تمنا لئے جیتا ہے اور اسکی تمنا پوری نہیں ہوتی، اسلئے محبوب کے وصل کا ملاقات کا کوئی تو ذریعہ بنایئے اس میں چاہے مراد پوری ہو یا نہ ہو۔

6.7 غزل ۵ کا متن اور اسکی تشریح :

یار سے ہم نے بے ادائی کی　　وصل کی رات لڑائی کی
بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ　　اب توقع نہیں رہائی کی
خندۂ یار سے طرف ہوکر　　برق نے جگ ہسائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا　　عشق نے زور آزمائی کی
چپکے اس کی گلی میں پھرتے رہے　　دیر واں ہم نے بے نوائی کی
میرؔ کی بندگی میں جانبازی　　سیری ہوگئی خدائی کی

6.7.1 شعر ۱: یار سے ہم نے بے ادائی کی

میرؔ سلاست روانی، معنوں کی گہرائی اثر کو قائم رکھتے ہیں یہ ان کی شعری خوبی ہے، میں میرؔ نے آسان اور سادہ الفاظ میں ایک فطری کیفیت کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں عشق کے بھی آداب ہوتے ہیں ان کا خیال رکھنا تہذیب عشق کہلاتا ہے، ہم نے وصل کی رات معشوق سے لڑائی چھیڑ کر نہایت غیر شریفانہ حرکت کی۔

6.7.2 شعر۲: بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ

یہ شعر سہل ممتنع کی مثال ہے، سہل ممتنع حسن بیان کی ایک خوبی ہے، یہ ایک ایسا انداز ہے جس میں ہر کوئی شعر کو پڑھ کہ یہ بات دل میں لاتا ہے کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں، لیکن کہنے کی کوشش کرے تو کہہ نہیں سکتا، میرؔ کہتے ہیں بہار کے موسم میں ہمارے پر نکل آئے تھے اور پنکھ بھی مضبوط ہو گئے تھے لیکن بہار کا موسم جیسے ہی گیا پر جھڑ گئے بازوؤں میں طاقت نہ رہی، اب آزاد ہونے کی امید باقی نہیں ہے۔ یعنی بہار کے موسم کے آتے ہی عاشقوں کا جوش وجنوں بڑھ جاتا ہے، اور اس موسم کے رخصت ہوتے ہی پھر اداسی اور غم بڑھ جاتا ہے۔

6.7.3 شعر۳: خندہ ءیار سے طرف ہو کر

اس شعر میں میرؔ معشوق کی مسکراہٹ اور بجلی کا مقابلہ کر کے معشوق کی ہنسی کو بجلی سے بھی زیادہ پر اثر بتایا ہے، ہمارے محبوب کی ہنسی لوگوں کے دلوں پر بجلیاں گراتی ہے، جس سے انسانی دنیا میں ایک تڑپ اور بے چینی پھیل جاتی ہے، آسمانی بجلی میں وہ اثر کہاں۔ آسمانی بجلی نے معشوق کی ہنسی کے سامنے آ کر خود اپنا مذاق بنا لیا ہے۔

6.7.4 شعر۴: کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا

اس شعر میں تلمیح ہے، تلمیح شعر میں الفاظ کے ذریعے کسی واقعے کی طرف اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں فرہاد اور شیریں کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے، کہتے ہیں فرہاد پہاڑ کو توڑ کر دودھ کی نہر کہاں سے لا سکتا تھا در اصل یہ عشق ہے جس نے اس سے ایسا ناقابل یقین کام کروایا۔

6.7.5 شعر۵: چپکے اس کی گلی میں پھرتے رہے

میرؔ کہتے ہیں اس کی گلی میں ہم کئی دفعہ خاموشی سے گئے اور وہاں اس کو دیکھنے کی آرزو میں پھرتے رہے، لیکن کامیابی نہ ہوئی وہاں دیر تک اپنی بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے، ہماری صدا سننے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

6.7.6 شعر۶: میرؔ کی بندگی میں جانبازی

نہایت سادہ سلیس اور رواں انداز میں میرؔ نے اہل طریقت کے سلوک کی منزلوں کو طے کرنے کی بات بیان کی ہے، ہم نے خدا کی بندگی کو پورا کرنے میں جان کی بازی لگادی، ساری دنیا پھر کر بندگی کی مختلف حالتوں کا مطالعہ کیا کئی ریاضتیں کیں، تن من دھن سے اس کی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ ہم کو اس میں خدا کی رحمتوں، کرشموں اور اس کی قدرت کی حیران کن طاقتوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح ہم جان گئے کہ خدائی کیا ہے، اور بندگی کیا ہے۔

6.8 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے میرؔ کی منتخب پانچ غزلیں اور انکی تشریح کے بارے میں واقف کرایا، اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات پائیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف غزلوں اور ان کی تشریح سے میرؔ کے نظریات اور ان کی فکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا۔ توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

6.9 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ میرؔ کی غزل گوئی پر ایک جامع نوٹ لکھئے۔

۲۔ میرؔ کی غزلوں میں خارجی اور داخلی عناصر پائے جاتے ہیں، بحث کیجئے۔

۳۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجئے۔

۱۔ ناز کی اس کے لب کی کیا کہئے ☆ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

۲۔ بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں ☆ حالت ایک اضطراب کی سی ہے

۳۔سرگذشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا☆سو گئے تم نہ سنی ہائے کہانی اس کی

۴۔بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا☆پر ملی خاک میں سب سحر بیانی اس کی

۵۔دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع☆لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے

۶۔غیرت عشق کسو وقت بلا تھی ہم کو☆تھوڑی آزردگی میں ترک وفا کرتے تھے

۷۔مترتب ہو نفع جو کچھ بھی☆دل کی بیماری کی دوا کریئے

۸۔داد فریاد جا بجا کریئے☆شاید اس کے دل میں جا کریئے

۹۔بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ☆اب توقع نہیں رہائی کی

۱۰۔کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا☆عشق نے زور آزمائی کی

6.10 فرہنگ :

لفظ	معنی	لفظ	معنی
غم جاناں	معشوق کا غم	غم روزگار، غم دوران	{روزی روٹی کا غم، زمانے کا غم}
نجیبوں	شریف زادے حسب ونسب کی اصلیت		
سوز و گداز	درد واثر	آلام ومصائب	تکلیفیں اور مصیبتیں
دلنشیں	دل پر اثر کرنے والا	غنائیت	موسیقیت
فصاحت	خوش کلامی، خوش بیانی	بلاغت	معنوں کی گہرائی
مرگ	موت	حباب	بلبلہ
سراب	دھوکا فریب	اضطراب	بے چینی
خانہ خراب	گھر کو برباد کرنے والا	نیم باز	ادھ کھلی
ثانی	دوسرا	پراگندہ	پریشاں
سحر بیانی	جادوئی بیان	عجز	انکساری

سرگذشت	آپ بیتی	ٹھیس	چوٹ
حیف	افسوس	اندوہ	غم
لالے پڑنا	بہت بڑی مشکل	کبھو	کبھی
کسو	کسی	آب رواں	بہتا ہوا پانی
آزردگی	غم رنج	دیر	مندر
مانع	رکاوٹ	تعب	تکلیف سختی، رنج آزار
منتیں	گذارش	حقوق العباد	بندوں کے حق
موہوم	بے بھروسہ، بے ثبات، فانی	مترتب	ترتیب دینا
تلک	تک	اظہار	ظاہر کرنا بتانا
جگ ہنسائی	بے عزتی	بے نوائی	مفلسی بے بسی

6.11 سفارش کردہ کتابیں :

۱۔ انتخاب کلام میر — مولوی عبدالحق

۲۔ میر کی غزل گوئی — راشد آزر

۳۔ پیغمبران سخن — علی سردار جعفری

۴۔ شعر شعور انگیز — شمس الرحمن فاروقی

پروفیسر افروز احمد

وظیفہ یاب، جے ایس ایس کالج، اوٹی روڈ، میسور

اکائی۔۷: میرؔ کی منتخب پانچ غزلیں اور تشریح :

ساخت:

7.0 اغراض ومقاصد

7.1 تمہید

7.2 میرؔ کی منتخب پانچ غزلیں غزل نمبر۶: متن اور تشریح:

7.3 غزل نمبر۔۷: متن اور تشریح:

7.4 غزل نمبر۔۸: متن اور تشریح:

7.5 غزل نمبر۔۹: متن اور تشریح:

7.6 غزل نمبر۔۱۰: متن اور تشریح:

7.7 خلاصہ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.9 فرہنگ

7.10 سفارش کردہ کتابیں

7.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ میرؔ کی مزید پانچ غزلوں سے واقف ہو جائیں گے اور ان کے کلام کی خوبیوں کے متعلق جان سکیں گے۔ ان کی غزلوں کی خارجی اور داخلی گہرائیوں کو سمجھ پائیں گے۔

7.1 تمہید :

اس اکائی میں میرؔ کی اور پانچ غزلوں پر روشنی ڈالی جائیگی۔ پہلی اکائی میں آپ نے میرؔ کے کلام کی بہت سی خوبیوں سے واقفیت حاصل کر لی لیکن میرؔ کا کلام خارجی اور داخلی معنوں کا ایک سمندر ہے، جتنا اس کی گہرائی میں اتریں گے اتنے ہی نئے نئے معنی نکلتے جائیں گے۔ آیئے اب اس نصاب میں شامل ان پانچ غزلوں کا مطالعہ کریں۔

7.2 میر کی پانچ منتخب غزلیں :غزل ٦ ہ : متن اور اسکی تشریح:

گل نے کہا بہت کہ چمن سے نہ جایئے — گلگشت کو جو آیئے آنکھوں پر آیئے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا — وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھایئے
صحبت عجیب طرح کی پڑی اتفاق ہائے — کھو بیٹھئے جو آپ کو تو اس کو پایئے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں — اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگایئے
اے ہمدم ابتداء سے ہے آدم کشی میں عشق — طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لایئے
اتنی بھی کیا ہے دیدہ ورائی کہ غیر سے — آنکھیں لڑایئے ہمیں آنکھیں دکھایئے
مچلا ہے وہ تو دیکھ کے لیتا ہے آنکھیں موند — سوتا پڑا ہو کوئی تو اس کو جگایئے

7.2.1 تشریح :

7.2.1 گل نے کہا بہت کہ چمن سے نہ جایئے

یہ شعر میرؔ نے بات چیت کے انداز میں کہا ہے معنوں اور اثر کی کیفیت سے بھرپور ہے۔ بیان کرنے کا انداز ایسا ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے، پھول کھلے ہیں اور چمن مجھے آواز دے رہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ، چمن کی سیر کو آؤ تو سر آنکھوں پر آؤ۔ اس میں میرؔ نے گل سے معشوق کو کنایہ کیا

ہے، معشوق کہتا ہے کہ ابھی تم کو آئے دیر ہی کتنی ہوئی ابھی نہ جاؤ جب بھی ہم سے ملنے آؤ گے، ہم اپنی آنکھیں بچھائے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

7.2.2 شعر۲ : میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا

میں نے لاپرواہی کی اور اس کی محفل سے نکل گیا، میری پریشان حالی میں خود پھنسا ہوا تھا میرے پاس کسی کے ناز اٹھانے کی طاقت ہی کہاں تھی۔

7.2.3 شعر۳ :صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے

میرؔ نے اس شعر میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، فنا فی اللہ کے فلسفے کو نظم کیا، ہم کو ایسے شخص سے عشق ہو گیا جس کو پانا ہو تو اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے۔ اتفاقات دیکھئے کہ ہم خدا کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور اس راہ کی منزلیں طئے کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس کا پانا ہے تو اپنا تن من دھن سب کچھ کھونا ہے۔ نہایت سادہ اور رواں انداز میں اتنی گہری بات انہوں نے کہی ہے۔

7.2.4 شعر۴ :خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں

میرؔ کہتے ہیں ہمارے معشوق کے گیان دھیان نے ہم پر وہ ستم ڈھائے کہ زندگی رنج والم میں ڈوب گئی۔ اس کے خیال کی وجہ سے نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو چین اگر ہمارا بس چلے تو کبھی کسی سے محبت نہ کریں۔ لیکن عشق ہو جاتا ہے کیا نہیں جاتا یہ ایسی مجبوری ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔

7.2.5 شعر۵ :اے ہمدم ابتداء سے ہے آدم کشی میں عشق

میرؔ کہتے ہیں عشق ایسی بری بلا ہے جو آدم کی اولاد کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ آدم کی اولاد کو ختم کرنا اس کا شیوہ ہے۔ جو بھی اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ سکون اور چین سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے میرؔ نصیحت کرتے ہیں کہ اے آدم کی اولاد کبھی اس مصیبت میں مبتلا نہ ہونا۔ عشق کو کبھی گلے نہ لگانا۔

7.2.6 شعر۶ :اتنی بھی کیا ہے دیدہ ورائی کہ غیر سے

میرؔ نے معشوق کی ستم گری اور سنگ دلی کی شکایت کی ہے، کہتے ہیں تمہارا یہ کیا انداز ہے کہ تم رقیب سے تو محبت اور شرافت سے پیش آتے ہو۔ اس کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہو لیکن جب ہم آتے

ہیں تم غصے سے آنکھیں دکھانے لگتے ہو، یہ کونسی شرافت ہے۔

7.2.7 شعر ۷ : مچلا ہے وہ تو دیکھ کے لیتا ہے آنکھیں موند☆ سوتا پڑا ہوا کوئی تو اس کو جگائیے

ہمارا معشوق اتنا مکار ہے کہ بظاہر آنکھیں بند کر کے پڑا رہتا ہے، لیکن کنکھیوں سے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے، ایسے وقت میں دھوکا کھانے کی بجائے اگر وہ سو بھی رہا تو اس کو جگانا چاہیے، یہ اس کا ایک طرح کا ناز و انداز ہے۔

7.3 غزل ۔ ۷ : متن اور اسکی تشریح:

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے — کچھ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
یہ راہ روش سرو گلستان میں نہ ہوگی — اس قامت دلچسپ کا انداز دگر ہے
وہ ناوکِ دل دوز ہے لاگو مرے جی کا — تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھ کو جگر ہے
کیا جان کہ جس کے لئے منہ موڑیئے تم سے — تم آؤ چلے داعیہ کچھ تم کو اگر ہے
شب شور و فغاں کرتے گئی مجھ کو لو اب تو — دلکش ہو ٹک اے مرغِ چمن وقتِ سحر ہے
سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود — اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے — کیا ساتھ نزاکت کے رگ گل سی کمر ہے
کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا — اے آہ سحر گاہ اگر تجھ کو اثر ہے
ہر بیت میں کیا میرؔ تیری باتیں گھٹی ہیں — کچھ اور سخن کر کہ غزل سلک گہر ہے

7.3.1 تشریح : شعر ۱: آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے

میرؔ کہتے ہیں ہمارے کان آنکھوں کی طرف لگے ہوئے ہیں اور ہماری آنکھیں اتنی بے چین

سی کیوں ہیں کیوں بار بار کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں اور یہ بے قراری دراصل اس لئے ہے کہ آج ہمارے معشوق کے آنے کی خبر چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے

7.3.2 شعر۲: یہ راہ روش سرو گلستان میں نہ ہوگی

میرؔ کہتے ہیں چمن میں سرو کی قطاریں اور پھولوں کی روش نہایت دلکش ہے لیکن ہمارے سرو قد معشوق اورس کا حسن اتنا دلربا ہے کہ یہ سب اس کے سامنے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

7.3.3 شعر۳: وہ ناوک دلدوز ہے لاگو میرے جی کا

میرؔ کہتے ہیں اس کی آنکھوں کے تیر نے میری جان نکال لی ہے، میرا صبر و قرار جاتا رہا ہے، اب جینے کی تمنا نہیں ہے۔ اے میرے دوست تو میری باتوں پر یقین نہیں کرتا اور ہنس رہا ہے اگر واقعی تجھ میں ہمت ہے تو اس میدان میں قدم رکھ کر دیکھ تجھے خود اس کا تجربہ ہو جائیگا۔ یعنی عشق میں مبتلا ہونا بلاؤں کو دعوت دینا ہے۔ جو عشق میں پھنس جاتا ہے اس کی زندگی سے چین اور آرام ختم ہو جاتا ہے ایک لمحہ بھی سکوں کا نصیب نہیں ہوتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔

7.3.4 شعر۴: کیا جان کہ جس کے لئے منہ موڑ یئے تم سے

ہم محبت میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہیں یہ جان کیا ایسی ہزار جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر تم ہم کو آزمانہ چاہتے ہو تو ہماری طرف سے تم کو کھلی دعوت ہے، کبھی بھی آ کر آزما سکتے ہو۔

7.3.5 شعر۵: شب شور و فغان کرتے گئی مجھ کو لو اب تو

اے بلبل ساری رات تم نے آہ و فریاد کرتے گذاری، تمہارے نالہ و فریاد سے ہمارا چین اور آرام ختم ہو گیا، اب صبح ہونے کو آئی ہے، اب تو کچھ دیر کے لئے چپ ہو جاؤ تا کہ کچھ تو سکون اور آرام ملے۔

7.3.6 شعر۶: سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھ سود

میرؔ کہتے ہیں ہم نے سوچا تھا کہ محبت میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا، ہم ہوں گے معشوق ہوگا دریا کا کنارہ ہوگا، پرندوں کے نغمے ہوں گے خوب گذرے گی، عشق کے میدان میں قدم رکھا اور چین گیا، آرام گیا اور اب تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بیماری ہماری جان ہی لے کر چھوڑے گی، قدم قدم پر کانٹے بچھے ہیں ہر وقت مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا ہے۔

7.3.7 شعر۷: شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے

میرؔ کہتے ہیں ہمارا معشوق بڑا نازک ہے اس کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اگر کندھے پر پھولوں کا ہار بھی رکھتا ہے تو کندھے لچک جاتے ہیں، اس کی کمر تو اتنی نازک جیسے رگ گل۔ اس سے نازک کمر کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ میرؔ نے اس شعر میں نہایت مبالغہ سے کام لیا ہے، حسن تعلیل کی مثال یہ شعر ہے۔

7.3.8 شعر۸: کر کام سو دل میں گئی عرش پہ تو کیا

میرؔ نے آہ سحر گاہی سے متعلق نہایت انوکھا مضمون باندھا ہے، آہ سحر گاہی کے متعلق یہ بات مانی ہوتی ہے کہ وہ عرش سے جا کر ٹکراتی ہے اور ضرور اثر کرتی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں اے آہ سحر گاہی تو ہمارے معشوق کے دل میں اتر جائے اس پر اثر کرے تو ہم تیرے اثر کو مان لیں گے ورنہ نہیں۔

7.3.9 شعر۹: ہر بیت میں کیا میرؔ تری باتیں گھٹی ہیں

میرؔ نے اس شعر میں تعلّی سے کام لیا ہے، ان کے کلام کو دیکھتے ہوئے یہ تعلّی بھی معلوم نہیں ہوتی بلکہ حقیت معلوم ہوتی ہے، میرؔ کہتے ہیں تیری شاعری میں ایسی دلکش باتیں پائی جاتی ہیں، جو کسی اور کے پاس نہیں ہیں، ہر مصرع ایک شاہکار ہوتا ہے، تیری غزلیں تو موتی کی لڑیاں ہیں، تو اب شاعری کے دوسرے اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کر۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

سوال: ذیل سے کسی دو شعر کی تشریح کیجئے:

۱) میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا ☆ وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائے

۲) کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا ☆ اے آہ سحر گاہ اگر تجھ میں اثر ہے

جواب کے لئے (7.2.2) اور 7.3.8 کے تحت دیکھئے:

7.4 غزل کا متن : غزل ۔۸ اور اس کی تشریح :

عمر بھر ہم رہے شرابی سے　　دل پر خون کی اک گلابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ　　ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

7.4.1 تشریح : شعر۱: عمر بھر ہم رہے شرابی سے

یہ شعر میرؔ کے بہتّر (۷۲) نشتروں میں سے ایک ہے، یہ نہایت مشہور شعر ہے، سہل ممتنع کی بڑی اچھی مثال ہے، میرؔ نے نہایت رواں سادہ اور سلیس الفاظ میں اپنی زندگی کی ساری کیفیت اور سیرت بیان کر دی ہے۔ اس انداز سے انہوں نے اپنی شاعری کو کمال عروج تک پہنچایا، کہتے ہیں ہم عمر بھر اپنے حال میں مست رہے کم ہی کسی کی پرواہ کی۔ ہم نے کبھی اپنی غیرت اور خودداری کو نہ چھوڑا، طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ زمانے کی تکلیفیں بھی اور عشق کی مصیبتیں بھی ہم نے کبھی ہمت نہ ہاری ایسی ہی مست حالت میں ساری زندگی گذار دی۔

7.4.2 شعر۲: کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

میرؔ نے اس شعر میں الفاظ کے تکرار سے کوبی پیدا کی ہے۔ایک خارجی کیفیت کو داخلی رنگ میں رنگ دیا ہے، اپنے معشوق کو ایسی عزت بخشی ہے جو کم ہی کسی کے پاس نظر آتی ہے، کہتے ہیں ہمارا معشوق اتنا دلربا ہے کہ اس کی ہر ادا کائنات کی دوسری چیزوں پر اثر ڈالتی ہے، یہ کلی جو چمن میں آہستہ آہستہ کھلتی ہے، اس نے ایسا کھلنا ہمارا محبوب کی ادھ کھلی آنکھوں سے سیکھا ہے۔

7.4.3 شعر۳: کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ

میرؔ کہتے ہیں عشق میں کامیابی حاصل کرنا اتنا آسان نہیں اس میں طرح طرح کی آفات و بلایات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تن من دھن داؤ پر لگانا پڑتا ہے، عزتِ نفس کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے، یہ عاشق کی جان لے کر چھوڑتا ہے، ہم بہت ہی بے صبر نکلے ہم نے جلد ہی اپنی جان قربان کر کے عشق کے ان جھمیلوں سے پیچھا چھڑا لیا۔

7.5 غزل کا متن : غزل ۔۹اور اسکی تشریح:

نالہء عجز نقص الفت ہے رنج و محنت کمال راحت ہے
تادم مرگ غم خوشی کا نہیں دل آزردہ گر سلامت ہے
تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے چاہئے یوں جو فی ا لحقیقت ہے
تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مئے خانہ واعظا! اپنی اپنی قسمت ہے
تربت میرؔ پر ہیں اہل سخن ہر طرف حرف ہے، حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل باخدا واجب الزیارت ہے

7.5.1 شعر ۱ : نالہء عجز نقص الفت ہے

میؔر کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے، صوفیوں کے مذہب میں سچا عاشق وہ ہے جو معشوق کی طرف سے آئی ہوئی کسی بات پر شکوہ شکایت نہ کی جائے۔ کامل وہی ہے جو صبر و استقامت سے کام لے، میؔر نے اسی مضمون کو بڑے ہی پر اثر انداز میں باندھا ہے، کہتے ہیں عشق میں آہ وزاری کرنا محبت کی خامی کی علامت ہوتی ہے، رنج اٹھانا اور ریاضت ومحنت سے منزل مقصود کو پانا بہت بڑا کمال ہے۔

7.5.2 شعر ۲ : تادم مرگ غم خوشی کانہیں :

اس شعر میں میؔر نے مصیبت تضاد کو استعمال کیا ہے غم اور خوشی کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ یکجا کیا ہے، کہتے ہیں اگر ہمارا رنجیدہ دل سلامت رہے تو مرنے تک ہمیں اس بات کا کوئی دکھ نہ ہوگا کہ ہم کو اس دنیا میں خوشی کیوں نصیب نہیں ہوئی۔

7.5.3 شعر ۳ : تیرا شکوہ مجھے نہ تیرا مجھے

میؔر اس شعر میں صلح کل کی نصیحت کرتے ہیں، یوں تو یہ شعر معشوق سے متعلق ہے لیکن دوسرے موقعوں پر بھی یہ وہی معنی دیتا ہے، میؔر کہتے ہیں جب ہم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو نہ مجھے تم سے کوئی رنج وشکایت ہونی چاہیئے، اور نہ ہی تم کو مجھ سے کوئی شکوہ۔

7.5.4 شعر ۴ : تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مے خانہ

اس شعر میں مسجد کی ضد میں مے خانہ لایا گیا، دنیا کے تمام شاعروں نے ہمارے واعظوں کی ریا کاری کی وجہ سے ان کو طنز کا نشانہ بنایا ہے، یہاں تک علامہ اقبال بھی کہتے ہیں؛

؎ بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں ☆ لرز جاتا ہے آواز اذاں سے

یہاں مے خانہ شراب خانے کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ عاشقوں اور صوفیوں

کے مست الست طریقہ کار کی جگہ کے لئے استعمال ہوا ہے، میرؔ کہتے ہیں اے واعظ یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ تجھ کو ظاہری عبادت اور روایتی انداز کا مقام ملا اور مجھے وہ جگہ ملی جہاں سے میں خدا کی قربت حاصل کرسکتا ہوں۔

7.5.5 شعر۵: تربت میرؔ پر ہیں اہل سخن

یہاں میرؔ نے لعلی سے کام لیا ہے، اور اپنی استادی کے بلدن مقام کا اظہار کیا ہے، کہتے ہیں میرؔ کے مرنے کے بعد بھی اس کی قبر پر شاعروں کا مجمع ہے، اور ہر ایک میرؔ کی شاعری کی عظمت کی باتیں کررہا ہے۔

7.5.6 شعر۶: تو بھی تقریب فاتحہ سے چل

مرنے کے بعد فاتحہ خوانی ایک عام سا رواج ہے، بقول اکبر الہ آبادی

؎ ہم جانتے ہیں مرنے کے بعد کیا ہوگا ☆ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

لیکن میرؔ بجا طور پر شہنشاہ غزل ہیں، اس معمولی سے بات کو بھی بڑے انوکھے انداز میں پر اثر بنا دیا ہے، کہتے ہیں اے میرؔ تو بھی فاتحہ کے بہانے اس کی قبر کے پاس چل خدا کی قسم یہ معشوق کی زیارت کا کتنا اچھا موقع ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

ذیل میں دیئے شعر کی تشریح کیجئے:

نالہء عجز نقصِ الفت ہے ☆ رنج و محبت کمال راحت ہے

جواب کے لئے 7.5.1 کے تحت دیکھئے:

7.6 غزل ۔ ۱۰ کا متن اور اس کی تشریح:

حرم کو جایئے یا دیر میں بسر کریئے　　تیری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریئے
کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی　　کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریئے
ہوا ہے دن کو تو جدائی کا سو تعب سے شام　　شب فراق کس اُمید پر بسر کریئے

7.6.1 شعر۱ :حرم کو جایئے یا دیر میں بسر کریئے

میرؔ کا یہ شعر نہایت شاندار ہے اس میں انہوں نے ولیوں صوفیوں جوگیوں سنیاسیوں بلکہ خدا کی تلاش میں رہنے والے تمام لوگوں کی دلی کیفیت کو اتنے سادے اور پر اثر انداز میں بیان کیا ہے، کہتے ہیں ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے، یعنی خدائے تعالیٰ کی طرف لوٹنا چاہتی ہے، انسان اس کوشش میں شروع ہی سے سرگرداں ہے۔

میرؔ کہتے ہیں انسان خدا کو پانے کے لئے کبھی حرم کے چکر لگا رہا ہے کبھی مندر، تو کبھی کلیسا کے دل کو کہیں چین نصیب نہیں گو تو ہر جگہ موجود ہے، ہمارے پاس صرف ایک دل ہے، آخر تجھے پانے کے لئے کہاں کہاں کے چکر لگاؤں، کسے دل میں بٹھاؤں اور کسے چھوڑوں، عجب پریشانی کا عالم ہے۔

7.6.2 شعر۲ : کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی

میرؔ کہتے ہیں تیری جدائی میں ہماری یہ حالت ہے کہ تیرا نام سنتے ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، اور دنیا کا ہوش و حواس باقی نہیں رہتا، اس طرح ہم کب تک زندگی گذارتے رہیں گے، خود میرؔ نے ایک اور جگہ کہا ہے:

جب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آوے ☆ اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

7.6.3 شعر۳ :ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کا غم انتہاء کو پہنچا ہوا تھا، بڑے ہی دردناک انداز میں کہتے

ہیں جدائی کا دن بے قراری میں گزرتا ہے، اور شام بڑی سخت تکلیف سے گزرتی ہے، جب دن کا یہ عالم ہے تو میں کس امید پر آخر دوسرے دن زندہ رہنے کی امید رکھوں بقول غالبؔ:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے ☆ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

7.7 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے میرؔ کی منتخب کی ہوئی پانچ غزلوں کا متن اور ان کی تشریح پیش کی ہے، اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ اپنے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات پائیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف غزلوں میں میرؔ کے افکار و نظریات کیا تھے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی، آخر میں نمونہء امتحانی سوالات بھی دیئے گئے ہیں، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، امید کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

7.8 نمونہ امتحانی سوالات :

1 میرؔ کی غزل ان کی زندگی کا مرقع ہے؟ بیان کیجئے:

2 میرؔ کو شہنشاہ غزل کہا جاتا ہے، اس پر روشنی ڈالیئے۔

3 درج ذیل اشعار کی تشریح کیجئے

۱ اے ہمدم ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق ☆ طبع شریف اپنی نہ ایدھر کو لائے

۲ اتنی بھی کیا دیدہ ورائی کہ غیر سے ☆ آنکھیں لڑائیے ہمیں آنکھیں دکھائیے

۳ وہ ناوک دل دوز ہے لاگو مرے جی کا ☆ تو سامنے ہو ہمدم اگر تجھ کو جگر ہے

۴ کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا ☆ اے آہ سحر گاہ اگر تجھ میں اثر ہے

۵ عمر بھر ہم رہے شرابی سے ☆ دلِ پرخون کی اک گلابی سے

۶ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ☆ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

۷ تجھ کو مسجد ہے مجھ کو مے خانہ ☆ واعظا! اپنی اپنی قسمت ہے

۸ تو بھی تقریب فاتحہ سے چل ☆ یا خدا واجب الزیارت ہے

۹ حرم کو جایئے یا دیر میں بسر کریئے ☆ تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کریئے

۱۰ کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی ☆ کہ سنئے نام ترا اور چشم تر کریئے

7.9 فرهنگ :

لفظ	معنی	لفظ	معنی
گلگشت	چمن کی سیر	کسو	کسی
آدم کشی	آدم کی نسل کا قتل	ایدھر	ادھر
دیدہ وروائی	دیکھنا	گوش	کان
ہمدم	دوست	داعید	بلانے والی مراد بلانا
سود	فائدہ	ٹک	ذرا
ضرر	نقصاں	دگر	دیگر، الگ
گھٹی	چھپی ہوئی	دل پرخوں	غمی دل
نیم خوابی	ادھ کھلی	شتابی	جلدی
عجز	انکسار	نقص	خامی
تربت	قبر	تقریب	مجلس
حرم	مسجد	دیر	مندر
تعب	سختی تکلیف، رنج، آزر	فراق	جدائی
تلک	تک	سلک گہر	موتی پرونا
واعظا	واعظ کہنے والا، ناصح		

7.10 سفارش کردہ کتابیں :

۱۔نقد میر	ڈاکٹر سید عبداللہ
۲۔انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق
۳۔میر تقی میرؔ حیات اور شاعری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
۴۔نئے تنقیدی زاویئے	ڈاکٹر خوشحال زیدی
۵۔شعر شور انگیز	شمس الرحمٰن فاروقی

پروفیسر افروز احمد

وظیفہ یاب ، جے یس یس کالج،

اوٹی روڈ، میسور

اکائی ۔۸:میرؔ کی منتخب نظمیں

ساخت:

8.0 اغراض ومقاصد

8.1 تمہید

8.2 میر کی نظم نگاری

8.3 میر کی منتخب مثنویاں مثنوی "جھوٹ "متن

8.3.1 مثنوی "جھوٹ" کا تجزیہ

8.4 مثنوی "دنیا" متن

8.4.1 مثنوی "دنیا" تشریح

8.5 مثنوی "شہر آشوب "متن

8.5.1 مثنوی "شہر آشوب" کا تجزیہ

8.6 خلاصہ

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.8 فرہنگ

8.9 سفارشی کتابیں

8.1 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ میرؔ کی نظم نگاری، جو زیادہ تر مثنویوں کے فارم میں ہے، اسے جان سکیں، میر کی نظم نگاری کی خصوصیات سمجھ سکیں، اس اکائی میں منتخب تین الگ مثنویوں کے متن اور اس کی فنی خوبیوں کا جزءہ لے سکیں، اور اپنے طور پر بیان کر سکیں۔

8.1 تمہید :

اس اکائی میں ہم میرؔ کی نظمیں جو مثنویوں کی شکل میں ہیں ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے، میرؔ کی نظم نگاری کی خصوصیات رقم کریں گے اور تین مختلف مثنویوں کے ذریعہ میر کی شعری خوبیوں کا جائزہ لیں گے اور اس سے آپ ی جان سکیں گے کہ میرؔ نے ان میں کیا کمالات دکھائے ہیں۔

8.2 میرؔ کی نظم نگاری :

میرؔ نے اپنی نظموں کو زیادہ تر یا تو مثنوی کی شکل میں لکھا ہے یا "شہر آشوب" کی شکل میں، بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب میرؔ نے پندرہ مثنویاں لکھی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے چوبیس مثنویاں بتائی ہیں۔ میرؔ نے مدحیہ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور عشقیہ مثنویاں بھی۔ انہوں نے ہجویہ مثنویاں بھی لکھی ہیں لیکن میرؔ کی طبعیت کا میلان ادھر نہ ہونے کی وجہ سے اس پر خصوصی توجہ نہ دی مگر ان مثنویوں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

> "مثنوی میں بھی میرؔ نے بیان کے انتظام اور تسلسل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، مطالب کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے جیسا کہ ماہر اور مشاق استاد کر سکتا ہے، عمدہ اور صاف شعروں کی کمی نہیں ہے۔ ان کی مثنویوں میں بے شرمی و بے حیائی کی باتیں کم پائی جاتی ہیں"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کی مثنویاں ندرت سے خالی نہیں ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ

> "میر مثنویوں میں طوالت کے بجائے اختصار سے کام لیتے ہیں"

میرؔ کی مثنویوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں برجستگی اور روانی پائی جاتی ہے، اپنے کمال فن

اور نکتہ رس دماغ سے میرؔ نے مثنوی کو ادب کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ ان کو فارسی مثنویوں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے، نظم مثنوی لکھتے وقت میرؔ کے سامنے قدیم خاکے تھے، اس لئے وہ روایت سے بغاوت نہ کر سکے اس لئے داستان کہنے کے انداز ہی میں یہ نظمیں بھی لکھنی پڑیں۔ میرؔ عشقیہ مثنویوں میں بڑے کامیاب رہے ہیں۔ ان میں بھی "شعلہ عشق" سب سے بہتر ہے۔ ایک سادہ اور مختصر سا حصہ ہے لیکن جس طرح انہوں نے اسے اٹھایا ہے اور اسے آخر تک نبھایا ہے، حقیقی رنگ میں دکھائی دیتی ہیں، مثنوی میں میرؔ جذبات نگاری کا کمال دکھاتے ہیں۔ میرؔ کی سب سے بڑی مثنوی "شکار نامہ" ہے، میر کی واقعائی مثنویاں بھی بڑی پائیدار ہیں۔ ان میں ہم کو میرؔ کی زندگی کے سچے واقعات مل جاتے ہیں، اس مثنوی میں جابجا غزلیں بھی لائی گئی ہیں اور اس میں نواب آصف الدولہ کے شکار کا حال ہے، اور اس میں فارسی رنگ ہے، زبان و بیان صاف و شیستہ ہے، میرؔ نے "جھوٹ کی مذمت" پر بھی مثنوی لکھی ہے، یہ بڑی ناصحانہ ہے، اور پر لطف انداز میں ہے اور تخئیل کی جولانی بھی ہے، میرؔ نے 'شہر آشوب' بھی لکھے ہیں، ان میں ایک نظم شاہ عالم کے دور حیات میں لکھی گئی، اس میں میرؔ نے اس دور کے بادشاہ کی کمزوری ملک کی پریشانی، دیہاتوں کا ابتر حال ایسے بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے پورا نقشہ آجاتا ہے، مثلاً شاہ عالم پر یہ شعر اس کا ثبوت ہے:

سو تو نکلے ہو کور بالم تم
ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

مثنوی " گھر کا حال" میں میرؔ نے اپنی تنگ دستی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے اپنے گھر کی خرابی اور برسات کی شکایت ہے برسات میں گھر کی بدحالی کا جیتا جاگتا نمونہ پیش کیا ہے اور آنکھوں کے سامنے بے سروسامانی کا نقشہ کھینچ جاتا ہے، اور غرباء پر اس موسم میں کیا گزرتی ہے اس کی عمدہ تصویر ہے، انہوں نے شہر آشوب بھی لکھے ہیں بلکہ ان کے اکثر اشعار شہر آشوب کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن خصوصیت سے چند نظموں کا نام شہر آشوب رکھا ہے۔ اس طرح کی نظمیں مخمس کی شکل میں ہیں۔ مثلاً مخمس در حال لشکر در شہر کا ما گفتہ شدہ وغیرہ اس میں میرؔ نے حکومت کی بے ثباتی،

ملک کی ابتری سپاہیوں کی تنگ دستی کو بیان کیا ہے۔

بہر حال میرؔ کے یہاں اندازِ بیان بہت سادہ و دلگداز ہے، میر کی مثنویوں کے بیسیوں شعر جو اب تک زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی لحاظ سے نیز اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں اور اس میں میں کوئی دو رائے نہیں کہ:

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا ☆ ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

8.3 میرؔ کی منتخب مثنویاں :

۱۔ مثنوی : جھوٹ (متن)

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے — شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا — کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی ہے شہر میں — اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے
اے جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہوگیا رواج — تیری متاع باب ہے ہر چار سو میں آج
اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیر سر ہے تو — اے جھوٹ سچ یہ ہے کہ عجیب فتنہ گر ہے تو
اے جھوٹ کب ہے عرصے میں تجھ سا حریف اب — تیرے ہی حکم کش ہیں وضع و شریف اب
اے جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعین سبھی — مرجائے کیوں نہ کوئی دے سچ بولیں نے کبھی
کہنے سے آج ان کے کوئی دل نہ شاد ہو — فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو
وعدے گھڑی کے پہروں سبھی آزما چکے — برسوں تک انتظار کیا جی ہی جاچکے
اے جھوٹ رنگ تیرے کوئی کیا کرے بیان — رکھتا ہے جیسے غنچہ زبان تو تہء زبان
یوسف کہ تھا بنی و صداقت شعار تھا — پھر حسن ظاہری سے وہ باغ و بہار تھا

پایانِ کار تیرے سبب چاک پیر ہن زندان میں جاکے برسوں رہا چھوڑ کر وطن
اے جھوٹ تو تو ایک دل آویز ہے بلا آشوب گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا
کس جان کنی سے کوہکنی کوہکن نے کی تصویرِ کھود شیریں کے پیش نظر رکھی
نزدیک یہ ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے اب صبح وشام غنچہء مقصود دل کھلے
دلالہ کے تو پردے میں آکام کرگیا دو باتوں میں وہ عاشق دل خستہ مرگیا
اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اٹھائے ہنگامہ و فساد بھی ہر سو رہا کیے
اے جھوٹ راستی سے تجھے گفتگو کہیں کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں
اے جھوٹ اس طرح میں بہت جی سے جاچکے وعدے میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آچکے
اے جھوٹ اس زمانے میں کیوں کر چلے معاش ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصہء تلاش
سردار جس سے سب متعلق ہے کاروبار سچ بولنا ہے اس کے تیئں سخت تنگ و عار
پھر سب مدار کا دروغی و مفتری صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری
مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام
اے جھوٹ میرا دل بھی بہت درد ناک ہے ان کا ذبوں سے صبح نمود جیب چاک ہے

8.3.1 "جھوٹ" کا تجزیہ :

میر نے اس نظم میں جھوٹ کی سخت مذمت کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دور میں تنزل کس حد تک آگیا تھا، چاروں طرف طوائف الملو کی تھی اور اخلاق بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، کہتے ہیں آج جھوٹ ہی جھوٹ کا راج ہے، ہر فرد و بشر نے جھوٹ کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔سب نے جھوٹ کو اپنی عادت بنالی ہے،اس میں بادشاہ وزیر،اور بھکاری کا کوئی فرق نہیں ہے۔ جھوٹ بڑی بری بلا ہے، اس نے سارے شہر کو اپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے، جھوٹ کی وجہ سے

قیامت کی تباہی اور بربادی پھیلی ہوئی ہے، چاروں طرف فتنے برپا ہیں، تمام انسانی خلقت جھوٹ کے سائے تلے جی رہی ہے۔ جھوٹ کا مقابلہ کرنے والا کوئی باقی نہیں ہے، کیا شریف کیا رذیل کیا معززین، سب جھوٹ کے حکم کے غلام ہیں۔ جھوٹ کا اثر اتنا بڑھ گیا ہے اور اس نے لوگوں کے دلوں میں ایسا گھر کرلیا ہے کہ لوگ جان دینے کو تیار ہیں، لیکن سچ بولنے کو تیار نہیں ہیں، جھوٹ کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے، کہ لوگ آج کے دن کو آج نہیں کہتے بلکہ کل کہتے ہیں اور کل اسے ان کی مراد قیامت کا دن ہوتا ہے۔ یعنی وعدہ جو کل کا کرتے ہین وہ قیامت ہی کو پورا ہوسکتا ہے، وعدہ خلافی کی یہ حالت ہے کہ جس سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی موت واقع ہوجاتی ہے، لیکن وعدہ پورا نہیں ہوتا، جھوٹ کے رنگ میں کیا دکھلاؤں، یہاں صاف منافقت ہے، لوگوں کی زبان پر کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور۔

اس کے بعد کے اشعار میں میرؔ نے تلمیح استعمال کی ہے، شعر میں کسی واقعے یا قصے کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں، اس حصہ کے اشعار قطعہ بند اشعار ہیں جس میں میرؔ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے، میرؔ کہتے ہیں یوسف علیہ السلام جن کو اللہ نے حسن کی دولت سے مالا مال کیا کیا تھا۔ عزیز مصر کے محل میں رہتے تھے۔ عزیز مصر کی بیوی نے ان پر زنا کا الزام لگایا، ان کے پیرہن کے پھٹنے کا جھوٹا الزام لگا کر ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ حضرت یوسفؑ اور زلیخا کی ساری کہانی اس میں پوشیدہ ہے۔ میرؔ کہتے ہیں جھوٹ بڑا دلکش ہوتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے سارے زمانے میں فتنے پیدا ہوتے ہیں، اس کے بعد کے شعر میں تلمیح ہے، یہ تلمیح شیرین اور فرہاد کے قصے کی ہے، اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح فرہاد نے شیرین کی فرمائش پر بے ستون پہاڑ کھودا اور دودھ کی نہر نکالی، ساتھ ہی وہ ہر کوس پر شیرین کی تصویر بھی بناتا گیا، جب کام پورا ہوا تو اس نے شیرین سے شادی کا مطالبہ کیا، لیکن شیرین کے شوہر نے ایک بوڑھی دلالہ کے ذریعہ یہ خبر اس تک پہنچائی کہ شیرین تو مرچکی ہے۔ اس جھوٹی خبر کو فرہاد برداشت نہ کرسکا اور تیشہ اپنے سر پر مار کر مرگیا،

میرؔ کہتے ہیں اس جھوٹ کی وجہ ہر زمانے میں نہ جانے کتنے فساد ہوئے، اور ہزاروں تباہیاں اور بربادیاں آئیں۔اس جھوٹ کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگ جھوٹے وعدوں کے پورا ہونے کے انتظار میں اس دنیا سے چلے گئے، موجودہ دور میں اس جھوٹ کی وجہ سے روزی، روٹی حاصل کرنا بھی بہت دشوار ہے۔اگر آج کے دور میں کوئی شخص "ہاں" کہتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ "نہیں" کہہ رہا ہے۔ جو قوم کے سردار ہیں ان کو سچ سے شرم آتی ہے۔ سچ اور کھری بات آج کل عیب میں داخل ہے اور جھوٹ وافترا ہنر بن گیا ہے۔غرض سچ بول کر کسی بھی کام میں کامیاب ہونا مشکل ترین چیز ہے۔ صرف باتیں ہی ہیں عمل کا نام ونشان نہیں۔ کتنے ہی لوگ چکنی چپڑی باتیں سنتے سنتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔اس جھوٹ کے کاروبار کو دیکھ دیکھ کر مرادل غم سے پھٹا جارہا ہے، اور صبح کی پو پھٹنے کی طرح میرا گریبان تارتار ہو گیا ہے، میرؔ نے یہاں صبح کاذب کی طرف کنایہ کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

۱۔ذیل سے کسی دو شعر کی تشریح کیجئے:

۱۔ اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کہ یہی سب کا طور ہے

۲۔ اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اٹھا کئے
ہنگامہ وفساد بھی ہر سو برپا کئے

۳۔ میرؔ کی مثنوی نگاری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھئے:

جواب: 8.4 اور 8.2 کے تحت دیکھئے:

8.4 مثنوی "دنیا" کا متن:

سنو اے عزیزاں ذی ہوش و عقل
کہ اس کاروں گہہ سے کرتا ہے نقل

پیمبر ہے ، شہہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

کہو گے کہ آگے تھا کہتا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی

بجا ہی کیا کو س رحلت مُدام
کنھوں نے نہ بجتا سنایاں مقام

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جاے بود اور باش

گدا ہو کہ شاہ عالی تبار
کہ خاک سب کا ہے دار القرار

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہوگئی
وہ رنگینئ باغ کیا ہوگئی

ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشان ہوے مرغ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا
چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ
رہا آب سوبھی روانی کے ساتھ

رہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی
رکن ہے جہاں باؤ کی لاگ تھی

نہ جدول رہے گی نہ سرواں
گلستان کو پاؤیں گے ہُو کا مکاں

زمین کا رہے گا یہی کیا سبھاؤ
لپٹ جائیں گے آسمان جیسے تاؤ

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب
چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جاے باش اور جاہے عجب

بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں
عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں

جوانی گئی موسم شیب ہے
شہود ایک دو روز کو غیب ہے

ہنسوں کیوں کہ ہستی میں دندان نما
کہ ہے جاے دنداں ہی دندان نما

گیا شور سر سے جھکا ہے بہت
گئی واشد اب دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھ نہیں ہوچکی صبح شام

بلا ارتعاش تن زار ہے
ہر اک عضو جلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوقِ صحبت کسے ہے دماغ

کہ کچھ یوں ہی عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی

نہ رکھئے جو عینک نہ آوے نظر
کہے تو کہ اعمٰی ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھ جو حرف زن ہو حریف
رہا سننے کی گوں نہ سمع شریف

صد افسوس لطفِ سماعت نہیں
صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا
جھکا سر جو زانو کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہوگئی
سفیدی موسے سحر ہوگئی

بدن زاء اعضا سبھی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس و کنار

جو یہ چال ہے جارہے ہیں ہم اب
دموں پر غرض آرہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرائے ران اور ساق
جئیں بیٹھیں کیونکر کہ جینا ہے شاق

و یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے
تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم
یہ سوچو کہ کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم

کہے میں نہیں اپنے ٹک پاودست
کیا خاک میں مجھ کو پیری نے پست

جو بازو ہیں اپنے سو بازو نہیں
اگر مونہہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں

بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور
وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور

جسدنا تواں جاے مہمان تنگ
سخن منہ پہ آوے و داعی کے رنگ

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ
درو بام پر حسرتوں سے نگاہ

شکن جلد میں دل کو پژ مردگی
عزیزی حرارت میں افسردگی

برودت بہت جسم میں آگئی
مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹھرا گئی

چھڑکتا رہوں منہ پہ میں آب کاش
کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش

وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے
پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے

سیہ رو ے شیب ستم کر گیا
لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مرگیا

قلم رکھ دے کر میرؔ ختمِ کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی و السلام

8.4.1 مثنوی "دنیا" کا تجزیہ :

میرؔ نے اس نظم میں دنیا کے تغیر وتبدل کو تفصیل سے لکھا ہے اس سے میرؔ کے گہرے مشاہدہ اور تجربے پر روشنی پڑتی ہے۔ بڑی موثر نظم ہے، بقول اقبالؔ

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں

اقبال کو بھی یہ خیال، شاید میر کی شاعری سے ملا ہوگا، میرؔ کہتے ہیں: اے! عقل مندو دانشورو اس چلتے ہوئے کارواں والی دنیا کے بارے میں غور سے سنو۔ غور سے دیکھو تو یہاں کی چیز سفر میں نظر آئیگی کتنی ہی بڑی ہستی کیوں نہ ہو اس کو ایک دن اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے، چاہے کوئی پیمبر ہو یا ولی سب کو یہی سفر درپیش ہے، تم لوگ یاد کرو گے کہ ہم سے میر یہ بات کہتا تھا، کہ کوئی یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتا، دنیا ایک سرائے ہے تھوڑی مدت کے لئے ہر شخص رہتا ہے، اور چلا جاتا ہے، ہمیشہ یہاں جانے کا ڈنکا ہی بجتا رہا ہے، ہمیشہ رہنے کی بات کسی نے نہیں کی۔ یہ آج جو محفل سجائے بیٹھے ہیں کل نہیں رہیں گے۔ جس کسی کو دیکھتے ہیں وہ یہاں سے چلنے کو تیار نظر آتا ہے بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے

ہیں، فقیر ہو یا بادشاہ کی آرام کی جگہ مٹی کے نیچے ہی ہے۔ سب کو خاک کے نیچے سونا ہے۔ پھولوں کی خوشبوں چمن و باغ کی خوش نمائی سب کو خزاں ہے، تر و تازہ پھول سوکھ کر مٹی میں مل جاتے ہیں، چہچہاتے ہوئے پرندوں کا نشان باقی نہیں رہتا، پروانہ جل کر مٹی میں مل جاتا ہے، اور چراغ بھی چند لمحوں کے لئے گھروں کو روشن کرتے ہیں۔ خاک بھی ہوا سے اڑ کر چلی جاتی ہے، اور بے نشان ہو جاتی ہے، پانی کو دیکھو تو وہ ہمیشہ رواں رہتا ہے، آگ ٹھنڈی ہو کر راکھ بن جاتی ہے، اس کی گرمی اور جوش ختم ہو جاتا ہے، جہاں غرور اور دشمنی تھی اب وہاں تربت کے سراہنے صرف ایک پتھر کا کتبہ باقی رہ گیا ہے۔ باغ کے روش کی خوشنمائی بھی ختم ہو جاتی ہے، چمن میں سرو کے درختوں کے قطار کی دلکشی ختم ہو جاتی ہے، زمین کی دلکشی کی بات تو دور کی بات ہے آسمان بھی کسی کاغذ کی طرح لپیٹ دیے جائیں گے، یہاں میرؔ نے قرآن کی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں کہا گیا ہے، آسمان قیامت کے دن کاغذ کی طرح لپیٹ دیئے جائیں گے، یہاں ٹھہراؤ بالکل نہیں ہے ہر چیز جانے کی جلدی میں دکھائی دیتی ہے، پہاڑ بھی اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، یہ دنیا ایک ماتمکدہ ہے، یہ دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ موت کا اب میں کیا بیاں کروں آنکھوں کے سامنے خاتمے کی نشانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جوانی تھوڑے عرصے میں ختم ہو جاتی ہے، اور جو ظاہر ہے وہ تھوڑی مدت میں غائب ہو جاتا ہے، میں کیسے ہنسوں کے میرے تمام دانت جھڑ گئے ہین، ہستا ہوں دانت کی بجائے صرف پوپلا منہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

اب وہ جوش و ولولہ باقی نہیں ہے، بڑھاپے کی وجہ سے تند مزاجی ختم ہو چکی ہے، دل میں پہلا سا جوش و خروش باقی نہیں ہے۔ اب ذائقے میں بھی فرق آ گیا ہے، قوت شامہ بھی ختم ہو چکی ہے، زندگی کی صبح شام بھی بدل چکی ہے۔ کمزور جسم کپکپی سے لرز رہا ہے، اور جسم کا ہر عضو اس دنیا سے رخصت ہونے کے لئے تیار ہے۔ حافظہ ختم ہو چکا ہے، اب دو حرف بھی یاد نہیں رہتے۔ کتنے پیارے اور بہترین شعر یادداشت سے چلے گئے ہیں مجھے یہ خاموشی کتنی تکلیف دیتی ہے کیا بیان کروں۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ اب لب ولہجہ بھی بدل گیا ہے باتوں میں لکنت آ گئی ہے، بات کہتے کچھ ہیں اور نکلتی کچھ

ہے۔ ہمیشہ قبر کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ دوستوں کی صحبت سے اور بھی وحشت ہوتی ہے۔ محفلوں میں دل نہیں لگتا۔ آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی ہے۔ عینک لگانی پڑتی ہے۔ عینک نہ لگائیں تو کچھ نظر نہیں آتا ہم آنکھوں کے اندھے ہو چکے ہیں۔ ہمارے مخالف ہم کو دیکھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔، کانوں کو ڈھنگ سے سنائی نہیں دیتا۔ افسوس صد افسوس کے بات سننے میں اب مزہ نہیں ہے، کیونکہ کوئی بات کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دور سے آواز آرہی ہو۔ شباب نے ہمارے ساتھ غداری کی اور جلد چلا گیا۔ اب ہمارا جسم جھک کر زمیں کو چھو رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں ہے۔ سر جھک کر گھٹنوں سے جا لگا ہے۔ بڑھاپے کو بڑے لطیف انداز میں جوانی کی رات کہا ہے۔ جوانی کی رات آ گئی اور سر کی سفیدی گویا زندگی کی صبح آخر ہے۔ سارا بدن کمزور ہے، لرز رہا ہے، محبوب کا بوسہ لینے کی کوشش کرتے ہیں، تو اس رعشہ کی وجہ وہ بھی نہیں ملتا۔ اس طرح ہم لڑکھڑاتے چلے جا رہے ہیں وہ دن دور نہیں کہ دنیا سے رخصت ہو جائیں، کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ٹانگیں کپکپانے لگتی ہیں۔ اب کیسے زندہ رہیں زندگی سے جی اچاٹ ہوگیا ہے، کمزوری کی وجہ سے بات کرنی دشوار ہے ورنہ ہمارے دل میں باتیں کرنے کے بہت ارمان ہیں۔ ہاتھ پاؤں ہمارے قابو میں نہیں ہیں۔ بڑھاپے نے ہم کو نہایت پستی میں دھکیل دیا ہے۔ ہاتھوں کی حالت پہلے جیسی نہیں ہے، اس بڑھاپے نے ہم کو خاک میں ملا دیا ہے، صورت کو دیکھو تو اب اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتے ہیں۔ بدن پوری طرح بدل چکا ہے، نہ اب وہ آنکھیں باقی ہیں، نہ شباب، جسم نہایت کمزور ہوگیا ہے، اب باتوں میں بھی صرف اس دنیا سے رخصت ہونے کی باتیں ہیں، ہونٹوں پر بڑھاپے کی آہیں ہیں، اور دنیا پر حسرت کی نگاہ ڈال رہے ہیں۔ جلد پر شکنیں پڑ گئی ہیں، جسم میں گرمی باقی نہیں ہے، جسم کی گرمی ٹھٹھرا کر سرد پڑ گئی ہے۔ اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کر کے کاش کاش کہتا رہتا ہوں، تاکہ روح کے زندہ رہنے کا احساس رہے، ورنہ کسی ٹمٹماتے چراغ کی طرح بجھ جاؤں گا، اور اٹھ کر بیٹھ جاؤں تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بڑھاپے نے مجھ پر بہت بڑا ستم کیا، میں تم کو کیا بتاؤں میں بظاہر زندہ ہوں، حقیقت میں مر چکا ہوں، اے میرؔ اب شاعری ختم کر اور دنیا والوں کو اپنا آخری سلام پیش کر۔

8.5 مثنوی : "شہر آشوب" کا متن :

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کی دیکھی یاں کی طرفہء معاش ہے لب نان پہ سو جگہ پر خاش
نے دم آب ہے نہ چمچہ آش

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگ دستم سے سب بحالِ خراب جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال کنجرے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال ایک تلوار نیچے ہے ایک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر باش

شور مطلق نہیں کسو سر میں زور باقی نہ اسب و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں خانہ جنگی سے امن لشکر میں
نہ کوئی رند ہے نہ کوئی اوباش

لعل خیمہ ہے جو سپہر اساس پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
بے زنا و شراب بے وسواس رعب کرلیجئے یہاں سے قیاس
قصہ کو تاہ رئیس ہیں عیاش

جتنے ہیں یاں امیر بے دستور پھر بہ حسنِ سلوک سب مشہور
پہونچنا ان تلک بہت ہے دور بات کہنے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار لچّے ہیں مستعدِ کار دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار لوٹ سے کچھ ہے گرمی بازار
سوہی قند سیاہ ہے یا ماش

درپہ عمدوں کا روز و شب شرو شور حرف یکسر فریب و رشوت خور
بے لئے دیکھیں نے کسو کی اور مردہ شوپر وہ سب کفن کے چور
رحمت اللہ براولین بناش

یک بیک گر کسو کی موت آئی اس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیوں کہ پہونچے ہے جن کو امرائی سب وے اولاد حاتم طائی
کون دے کر کفن اٹھاوے لاش

بالضرورت گیا میں جس کے گھر آدمی کی نہ جنس تھا و خر
بات کرنے لگا تو نیچی نظر بے مروت سفینہ مدنظر
قابل صد ہزار شاش و تراش

ہے جنہیں کچھ بھی رویت دربار سوفریبندہ مکری و غدار
کاذب و مفت بر ہے دل آزار ڈول ان کا ہے یہ کہ کریئے خوار
کام ان کا یہ ہے کہ خراش تراش

جس پہ ٹھہری ہے آکے سرداری ان سے ہم کو تھی چشم دلداری
معرفت ان کی بعد صد خواری فرد دستخط ہوئی جو یک باری
جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش

اس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ وہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ
جس پہ دستخط نہ ان نے جانا کچھ بن نہ آیا مجھے بہانا کچھ
غیر اس کے کہ لے اٹھوں بشاش

واں سے اٹھ کر میں پال میں آیا سخت تغیر حال میں آیا
بارہا یہ خیال میں آیا کہ زیاں شہ کے مال میں آیا
واسطے میرے سو مرا یہ قماش

بخش دوں جامہ تک جو ہو قدرت آٹھوں آنے ہیں خرچ یک ساعت
دس روپے دوں میں کس کو بے مہلت مقتضی ہووے کب مری ہمت
صاحبانِ کرم کے تئیں شاباش

ہو جو ان لوگوں میں گدا کا گزر سہم رہ جائیں سب یہ دیکھیں ادھر
دیر کے بعد یہ کہیں ہل کر شاہ جی لے خدا سبھوں کی خبر
سو بھی یہ بات ہووے از کنگاش

یاروں کی جود کا بیاں کیا ہے وہم میں ان کے بھی جہاں کیا ہے
آشکارا ہے سب نہاں کیا ہے دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے
ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش

بس قلم اب زبان کو اپنی سنبھال خوش نما کب ہے ایسے قال و مقال
ہے کڈھب چرخ روسیہ کی چال مصلحت ہے کہ رہیے ہو کر لال
فائدہ کیا ہے جو راز کریے فاش

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

I ذیل کے اشعار کی تشریح کیجئے:

ا۔ صدا فسوس لطف سماعت نہیں ☆ صدا دور سے جیسے آوے کہیں

۲۔ وگرنہ دیا سا بجھا جاے ہے ☆ پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے

II میرؔ نے دلی کی تباہی کا حال اپنی کس نظم میں پیش کیا ہے؟

جواب: 8.4.1 اور 8.5.1 کے تحت دیکھئے:

8.5.1 مثنوی "شہر آشوب" کا تجزیہ :

میرؔ نے شہر آشوب میں اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویریں بنائیں ہیں۔ اس وقت کے سماج کے حالات پر روشنی ڈالی۔ کہتے ہیں ہم کو اپنے روزی روٹی کی مشکل پیش آئی اور زندگی گزارنی مشکل ہوئی تو ہم فوج میں کام تلاش کرنے کے لئے نکلے یہاں آکر دیکھا کہ یہاں خود روٹیوں کے لالے پڑے ہیں روٹی کے لئے آپس میں لڑائی جھگڑے ہو رہے ہیں، روٹی ملنی تو دور کی بات ہے آش تک کسی کو میسّر نہیں، دوست واحباب بھوک سے مرنے کے قریب ہیں اور جو بھی جان پہچان والا ملا اس کے پاس جینے کا ساماں نہیں ہے۔ غربت کی وجہ سے سب کا حال خراب ہے، کسی کے پاس خیمہ ہے تو خیمہ باندھنے کی رسی نہیں۔ جس کے پاس قالین ہے اسے قالین بچھانے نوکر رکھنے کی طاقت نہیں۔ تمام لوگوں کے لئے زندگی نہایت تکلیف دہ ہوگئی ہے۔ ترکاری بیچنے والا بیوپار کے نہ ہونے کا رونا رو رہا ہے، غلہ بیچنے والا اپنا دکھڑا سنا رہا ہے۔ سپاہیوں کا یہی حال ہے کہ کام دھندا نہ ہونے کی وجہ سے بیکار بیٹھے ہیں۔ کیا بادشاہ، کیا فقیر سب کنگال ہو چکے ہیں، دولت منداب فقیر بن چکے ہیں۔ غریبی کا یہ عالم ہے کہ کھانا نہ ملنے کی وجہ سے جسم کی رگیں دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا چھوٹا کیا بڑا سب مفلسی کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اگر کہیں راستے میں روٹی کا ٹکڑا گرا ہوا دکھائی دیتا ہے تو ہزاروں فقیر مکھیوں کی

طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، کسی کے دماغ میں اب فتنہ پیدا کرنے کا خیال مطلق نہیں آتا ہے، دانا پانی نہ ہونے کی وجہ سے اونٹ اور گھوڑوں میں طاقت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اب نہ کوئی شرابی باقی رہا نہ کوئی آوارہ۔ سب جگہ بھوک ہی کا ذکر ہے۔ آپس کی لڑائی کی وجہ سے فوج میں دشمنوں سے لڑنے کا خیال بھی نہیں ہے، اس طرح یہ لشکر پرامن ہے۔ جو دولت مند ہیں جن کے پاس عالیشان خیمے ہیں وہ رنڈیوں کو ڈیروں میں پال رہے ہیں۔ ہمیشہ زنا اور شراب میں ڈوبے رہتے ہیں ان کے رعب کا اندازہ اسی سے ظاہر ہورہا ہے۔ قصہ مختصر دولت مند لوگ عیاش ہیں۔ جو امیر صاحب مسند ہیں اور جن کے فیاضی کے قصے مشہور ہیں ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے، اگر کوئی بڑی مشکلوں سے ان تک پہنچ کر عرض گذارش کرتا ہے تو وہ اس کو جھڑک کر اس کا دل توڑ دیتے ہیں۔ ایسے امیر چار بدمعاشوں کو اکٹھا کر کے کچھ سپاہیوں کو اپنے ساتھ رکھ کر بادشاہ بن بیٹھتے ہیں۔ اور دربار کرنے لگتے ہین۔ شریف اور نجیب سب بے عزت کئے جارہے ہیں، چاروں طرف لوٹ کا بازار گرم ہے۔ لیکن اب بازار میں صرف گڑ ملتا ہے یا ماش کے دانے۔ شریف لوگوں کے گھروں پر رات دن شور وغل رہتا ہے، زیادہ تر بحث وتکرار رشوت پر ہوتی رہتی ہے، بغیر پیسہء لئے وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے مردے کے کفن کو بھی یہ نہیں چھوڑتے۔ لاش پر صرف اللہ کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ اگر کسی کی اچانک موت آجائے اس مرے ہوئے بے چارے کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جتنے امیر ہیں سب حاتم طائی کی اولاد سے ہیں لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ کون کفن کے پیسے دے کر میّت کو اٹھوائے گا۔ میں اتفاق سے ایک ضرورت کی وجہ سے ایک امیر کے گھر گیا وہ آدمی کہاں تھا گدھے کی نسل تھا اس نے بات کرتے وقت نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ کون آیا ہے۔ وہ انسانیت سے عاری کمینہ تھا وہ قابل تھا کہ اس پر پیشاب کیا جائے اور گردن اڑادی جائے۔ وہ لوگ جو دربار میں کچھ رسوخ رکھتے ہیں، وہ فریبی اور مکار ہیں، قوم کے غدار ہیں، جھوٹے مفت خورے اور دلوں کو دکھ دینے والے ہیں ان کا طور طریقہ لوگوں کو شرمندہ کرتا ہے ان کا کام ہی دوسروں کا مال ہڑپ کرنا اور دوسروں کو دکھ دینا ہے۔ جو لوگ آج کل سردار ہیں ان میں سے ایک سے ہماری شناسائی تھی بڑی مشکل اور بے عزتی کے بعد آخر

کاران تک ہم پہنچے انہوں نے میری گذارش دیکھی اور دستخط کر دیئے۔ دستخط کیا کئے چند لکیریں کھینچ دیں۔ ان کی اس تحریر کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ بجائے کچھ عطا کرنے کے انہوں نے مجھے ٹالنے کیلئے یہ کام کیا میں بھی مجبور تھا کیا کرتا وہاں سے ہشاش بشاش چہرہ بنائے اٹھا وہاں سے اٹھ کر خیمہ میں آیا میری حالت غیر ہو چکی تھی، بار بار یہ خیال آتا تھا کے میری وجہ سے ان کے مال کو نقصان ہوا، میرے واسطے انہوں نے یہ تکلیف اٹھائی اور میرا برا حال تھا۔ اگر مجھ میں طاقت ہو تو پیسے تو کیا میں میرا لباس تک حاجت مندوں کو دے دوں اور ایک لمحے میں آٹھ آنے بھی پورے خرچ کر دوں، دس روپیئے ہوں تو بھی بغیر جھجک کے کسی سائل کو دے دوں دوسروں سے پوچھنا میری غیرت کے خلاف ہے، لیکن فیاض لوگوں کی سخاوت کا یہ حال ہے۔ ان امیروں کے پاس کوئی بھکاری آجائے تو وہ اس کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں، بہت دیر تک اس کو روکے رکھتے ہیں، اور سب مل کر آپس میں مشورہ کر کے کہتے ہیں شاہ جی اللہ سبھوں کو پالنے والا ہے آپ جائیے۔ دوستوں کی سخاوت کا حال کیا بیان کروں ان کی نظروں میں یہ دنیا وہم ہے ان کی ظاہری اور اندرونی حالت سب پر عیاں ہے یعنی نہایت مفلس ہیں کاش ہم ایسے لوگوں کی صحبت میں نہ ہوتے۔ اے میرؔ بس اب اپنے قلم کو روک لے تیری یہ باتیں کونسی بھلائی کی باتیں ہیں۔ یہ بے ڈھنگے آسمان کی گردش کا نتیجہ ہے اس زمانے میں بھلائی اسی میں ہے کہ بات کرنے کی بجائے خاموش گونگا رہا جائے۔

8.6 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپکو میر تقی میرؔ کی تین مثنویوں کا متن اور انکی تشریح سے واقف کرایا اور ساتھ ہی میرؔ کی مثنوی نگاری کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی۔ اغراض و مقاصد، تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف مثنویوں اور ان کی تشریح سے میر کی غزل کے علاوہ مثنوی بھی کن نظریات و افکار کی حامل ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ میرؔ نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ مثنوی میں بھی کس کمال کے ساتھ اپنی

فنکارانہ صلاحیتوں کو استعمال کیا ہے اس اکائی سے قبل کی اکائیوں میں ہم نے میرؔ کی مختلف اور منتخب غزلیں اور ان کی تشریح پیش کی جس کا مطالعہ آپ نے کیا۔ یہ اکائی بھی اسی قبیل کی ہے اس میں میرؔ کی مثنویوں کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا امید ہے کہ آپ ان سے ضرور مستفید ہوں گے۔

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ میرؔ نے اپنی نظم میں جھوٹ کی کن برائیوں پر روشنی ڈالی ہے؟ بیان کیجئے۔

۲۔ جھوٹ سے دنیا میں بڑے حادثے ہوئے ہیں؟ کوئی دو مثالیں دے کر سمجھائیں۔

۳۔ دنیا کی بے ثباتی پر میرؔ نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ بیان کیجئے۔

۴۔ بڑھاپے کی کن خرابیوں کو میرؔ نے بیان کیا ہے؟ واضح کیجئے۔

۵۔ میرؔ نے نظم شہر آشوب میں دلی کی بربادی کو مفصل بیان کیا ہے؟ روشنی ڈالئے

۶۔ نظم شہر آشوب میں میرؔ کے عہد کی تاریخ چھپی ہوئی ہے؟ وضاحت کیجئے۔

8.8 فرہنگ :

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شیوہ	طریقہ	شعار	رنگ ڈھنگ
دلق	فقیر بھکاری	متاع	دولت
حکم کش	حکم ماننے والے	وضیع	ادنیٰ
پیرہن	لباس	مقصود	داد
دلالہ	کٹنی	کاذب	جھوٹا

دروغی	جھوٹا	مفتری	جھوٹا الزام لگانا
رحلت	رخصت، موت	باؤ	غرور
لاگ	محبت دشمنی	شتاب	جلدی
سحاب	بادل	شیب	بڑھاپا، پیری
واشد	تیز مزاج	نسیاں	بھول، فراموشی
اعمٰی	اندھا، نابینا	اعمٰی	اندھا بے بصر
سماعت	سننے کی حس	مشام	سونگھنے کی قوت
ہمدم	دوست	ساق	ٹانگ
شاق	ناگوار	چتون	شباب
برودت	ٹھنڈک، سرد	ہال	خیمہ
طناب	خیمہ کی رسی	فراش	فرش بچھانے والا
جھینکے	روتے ہیں	قلاش	کنگال مفلس
اقل	کم	اکثر	زیادہ
خانہ جنگی	آپسی لڑائی	سپہر	آسمان
اساس	بنیاد	وسواس	وہم
قیاس	خیال	بے دستور	بے سند
لچے	بدمعاش	تلنگے	سپاہی
قندسیاہ	گڑ	مروت	انسانیت
سفیہ	کمینہ نیچ	انتعاش	عیش وعشرت

دلآزار	دل دکھانے والا	بشاش	خوش خوش
زیاں	نقصاں	قماش	مال اسباب
ساعت	گھڑی	کنگاش	مشورہ
لال	گونگا، سرخ پتھر	کڈھب	بے ڈھنگا

8.9 سفارش کردہ کتابیں :

۱۔ انتخاب کلام میر — مولوی عبدالحق

۲۔ میر اور مثنویات میر — پروفیسر وہاب اشرفی

۳۔ میر تقی میر حیات اور شاعری — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

۴۔ شعر شور انگیز — شمس الرحمٰن فاروقی

از: افروز احمد

سابق پروفیسر اور صدر شعبہء اردو، جے یس یس کالج، میسور

Karnataka State Open University

Manasagangothri, Mysore

Optional Urdu - I BA

Paper 1 - Course 1

Poetry and Prose

Block - 3 Unit 9-12

باب:3 اکائیاں:9-12

اردو ادب : اختیاری مضمون

بی لے ،تین سالہ ڈگری کورس

سالِ اوّل - بی لے - پرچہ اوّل

نظم ونثر

(بلاک:3۔اکائیاں:9-12)

۱۔ شیخ الجامعہ

پروفیسر کے ۔یس رنگاپا

۲۔ ڈین اکاڈمک

پروفیسر۔ جگدیشہ

۳۔ فیکلٹی ممبرس

۱۔ یم بلقیس بانو؛ صدرشعبہ اردو وکوآرڈینیٹر، کے یس او یو، میسور

٤۔ ڈاکٹر جھاں آراء بیگم؛ پروفیسر شعبہ ءاردو، کے یس او یو۔ میسور

٤۔ اراکین بورڈ :

۱۔ بلقیس بانو۔ یم، چیئر پرسن (یو جی (بی او یس))

۲۔ پروفیسر جھاں آراء بیگم ممبر۔

شعبہ ءاردو، کے یس او یو، میسور

۳۔ پروفیسر محمد صبغت اللہ ممبر۔

موظف پرنسپل گورنمنٹ بوائز کالج، کولار، کے جی یف

٤۔ پروفیسر نصرت جھاں ممبر۔

مہارانیس آرٹس وکامرس کالج، میسور

٥۔ پروفیسر محمد ثناء اللہ شریف ممبر۔

گورنمنٹ سرایم وی سائنس کالج، بھدراوتی، شیموگہ ضلع

٥۔ مصنف :

شیخ عطاء الرحمٰن ،لیکچرر، گورنمنٹ کالج، شری رنگ پٹن

٦۔ مدیرہ :

پروفیسر ممتاز زرینہ، وظیفہ یاب پرنسپل، مہاراجاس کالج، میسور

نصاب کا مقصد

یہ کتاب اردو ادب اختیاری مضمون کا ایک جزو ہے، جو بی اے سال اول کے کورس میں رکھی گئی ہے، پہلے باب یعنی بلاک-1 میں دیوان غالبؔ سے "ردیف الیف" کی غزلیات کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ باب 4-1 اکائیوں پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب یعنے بلاک 2 میں انتخاب کلام میرؔ (مرتب مولوی عبدالحق) سے منتخب غزلیں اور مثنویاں شامل ہیں۔ غزلوں اور مثنویوں کی تشریح اور تجزیئے کے ساتھ ساتھ شاعر کا تعارف انکی غزل اور نظم نگاری میں اہمیت اور انکے کلام کی خصوصیات بھی پیش کی گئی ہیں، تا کہ نصاب میں شامل اس شاعر کے کلام سے آپ لطف اندوز ہوں اور بھر پور استفادہ کریں، یہ باب 8-5 اکائیوں پر مشتمل ہے۔

تیسرا باب یا حصہ میں فیض احمد فیضؔ کی منتخب بارہ (12) نظموں کو شامل کیا گیا ہے، نقش فریادی سے چار (4) دست صبا سے چھے (6) اور زنداں نامہ سے دو (2)، ان منتخب نظموں کا متن اور تشریح کے ساتھ فیض احمد فیضؔ کی حیات انکی ادبی خدمات، نظم نگاری کی خصوصیات کے ساتھ اور دیگر تفصیلات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، یہ باب اکائیاں 12-9 پر مشتمل ہے۔

مذکورہ ابواب اردو شاعری کے لئے مختص ہیں اس کے علاوہ ان ابواب میں طلبہ کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے منتخب سوالات بھی دیئے گئے ہیں، تا کہ طلبہ اس سے مزید مستفید ہوسکیں ہر اکائی میں مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کے معنی بھی دیئے گئے ہیں اور اکائی کے آخر میں سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، امید ہے کہ طلبہ انہیں حاصل کر کے پڑھیں گے اور مزید اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے۔

باب ۔ ۳

یہ باب بی اے سال اول کے اختیاری مضمون کے لئے مخصوص ہے اور اردو نظم کا ایک جزو ہے، اور فیض احمد فیضؔ کی شاعری کے لئے مختص ہے، یہ باب 12-9 اکائیوں پر مشتمل ہے، یعنی کل 4 اکائیاں ہیں۔

اکائی ۹: کے تحت اردو میں نظم نگاری کی خصوصیات، فیضؔ کی حیات کے اہم پہلو پر، شاعر کی امتیازی خوبیاں بھی پیش کی گئی ہیں۔

اکائی ۱۰: کے تحت نقش فریادی مجموعہ فیض سے منتخب (چار) نظمیں دی گئی ہیں اور ساتھ ہی تجزیہ بھی دیا گیا ہے۔

اکائی ۱۱: کے تحت مجموعہ فیضؔ دست صبا سے منتخب چھے نظمیں دی گئی ہیں اور ساتھ ہی تجزیہ بھی دیا گیا ہے۔

اکائی ۱۲: کے تحت زنداں نامہ مجموعہ سے دو منتخب نظمیں اور تشریح دی گئی ہے۔

مذکورہ باب میں جتنی بھی اکائیاں ہیں ان میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، ہر اس اکائی سے متعلق دیگر تفصیلات پر بھی معلومات فراہم کئے گئے ہیں، تاکہ طلبہ کو اکائی کے سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو۔

مشمولات

حصہ نظم : باب ۳۔ اکائیاں (12-9)

اکائی 9 (i) اردو میں نظم نگاری اور اسکی خصوصیات

(ii) فیض احمد فیضؔ کی حیات وشاعری

اکائی10 کتاب: نقش فریادی (فیض احمد فیضؔ)

منتخب چار (4) نظمیں

(i) تنہائی

(ii) کتّے

(iii) مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اکائی11 کتاب: دست صبا (فیض احمد فیضؔ)

(i) شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

(ii) صبح ءآزادی

(iii) مرے ہمدم، مرے دوست

(iv) نثار میں تیری گلیوں کے۔۔۔۔

(v) زنداں کی ایک شام

(vi) زنداں کی ایک صبح

اکائی12 کتاب: زنداں نامہ: فیض احمد فیضؔ

(منتخب دو نظمیں)

(i) ملاقات

(ii) ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

اکائی۔۹ : i۔اردو میں نظم نگاری اور اس کی خصوصیات

ii۔فیض احمد فیض کی حیات و شاعری

ساخت:

9.0 اغراض و مقاصد

9.1 تمہید

9.2 اردو میں نظم نگاری اور اس کی خصوصیات

9.3 فیض احمد فیض کی حیات اور شاعری

9.4 خلاصہ

9.5 نمونہ امتحانی سوالات

9.6 فرہنگ

9.7 سفارشی کتب

9.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ آپ اردو زبان میں نظم نگاری کے دور سے واقف ہو سکیں۔

☆ اردو نظم نے اردو ادبی دنیا میں کیا انقلاب برپا کیا اس کی جانکاری حاصل کر سکیں۔

☆ دیگر اصناف سخن کے مقابلے نظم کی وسعت اور اس کی اہمیت کی جانکاری حاصل سکیں۔

☆ فیض احمد فیض کی حیات اور شاعری کے اہم پہلوؤں سے واقف ہو سکیں۔

9.1 تمہید :

اس اکائی میں نظم کی سماجی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیگر اصناف سخن کے مقابلے صنف نظم میں یہ خوبی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل کو پیش کرتے ہوئے ان کو حل کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر رکھتی ہے، اسی لئے ہمارے بزرگوں نے اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے اردو زبان میں رائج کرنے کی کوشش کی اور اس طرح اپنے کارناموں سے اردو ادب کو ایک یادگار صنف سخن سے نوازا۔ اور اس اکائی میں فیض احمد فیضؔ کی حیات و شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس کے مطالعے سے آپ کو ضرور اندازہ ہوگا کہ فیض نے اپنے مختلف نظریات سے کس خوبی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالے ہیں، اور اپنی حیات کو مشکل گذار راہوں سے آسانی کے ساتھ لے گئے ہیں، اور ان مشکلات و مصائب کی ذرا بھی شکن اپنی شاعری اور نہ ہی اپنی شخصیت پر آنے دی۔

9.2 اردو میں نظم نگاری اور اس کی خصوصیات :

اردو ادب کی سب سے مقبول صنف سخن غزل ہر دور میں رہی ہے۔ جوان بوڑھا، بچہ تعلیم یافتہ اور کم تعلیم یافتہ ہر کوئی غزل کا دیوانہ نظر آتا ہے۔ ایک زمانے تک اردو ادب میں غزل ہی غزل چھائی رہی۔ حتیٰ کہ سرسید کا دور آیا، یہ وہ دور تھا جہاں ہندوستانی قوم دوراہے پر کھڑی نظر آتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جبکہ مشرقی تہذیب آخری سانسیں لے رہی تھی، مغربی تہذیب ہندوستانی عوام میں آہستہ آہستہ جگہ بنا رہی تھی، مشرقی علوم سے لوگ کسی حد تک بیزار ہو چلے تھے اور مغربی علوم کے دلدادہ ہونے لگے تھے، ہندوستان میں جابجا کالج اور انگریزی علوم کے مدارس کھلنے لگے تھے، مسلمانوں کے مقابلے میں غیر اقوام نے جلد ہی مغربی علوم کو گلے لگا لیا، اور زمانہ میں ترقی کے زینے طے کرنے لگے۔ اس نازک دور میں سرسید نے اپنے ہمنواؤں کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی بیداری کیلئے صبح و شام جدوجہد کی، اور جو اسباب مہیا کر سکتے تھے ان کے لئے اپنی زندگی کی ساری کوششیں صرف کرنے لگے۔

ملک میں جو سیاسی انقلابات برپا ہو رہے تھے ان سب کا اثر زبان پر پڑنا لازمی تھا۔ راجا مہاراجاؤں، نوابوں امیروں اور وزیروں کے دربار ختم ہو چکے تھے، اس لئے اس دور کے شعراء کو ذہنی تبدیلی کرنی پڑی اس لئے اردو شاعری بھی جدید اردو شاعری ہی میں اپنی بقاء کا راستہ ڈھونڈنے لگی، کیونکہ دنیا بدل رہی تھی پرانے طرز پر زندگی سے کام چل نہیں سکتا، نئی وضع قطع اپناتے ہوئے مزاج کو بدلنا ہوگا۔ لہذا محمد حسین آزاد نے مناظر قدرت اور عام اخلاقی مضامین کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جس کا مقصد نئے رجحانات سے اردو شاعری کے سننے والوں کو آمادہ کرنا تھا، محمد حسین آزاد نے اپنی نظمیں پیش کیں تو حالی نے بھی یہی راستہ اپنایا اور اپنی ابتدائی نظمیں مناظرہ رحم وانصاف اور مثنوی بر کھارت پیش کیں جب ان دونوں نے یہ دیکھا کہ عوام کی رائے ان نظموں کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آرہی ہے تو ان دونوں کو اندازہ ہو گیا کہ عوام کے ذہن ودماغ میں نئے رجحانات جڑ پکڑنے لگے ہیں، اس جدید اردو شاعری نے انسانی زندگی میں عملی پہلو کو زیادہ اجاگر کرنے پر زور دیا، اور ہندوستانیوں کو عمل اور جدوجہد کی طرف بہتر سے بہتر انداز میں بلایا، اس تبدیلی نے بڑوں اور بچوں کے ادب کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی چنانچہ محمد حسین آزاد اور مولوی اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے بڑی محنت اور کدوکاوش سے نت نئی نظمیں لکھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ بطور نمونہ ان نظموں کے عنوانات ملاحظہ ہوں برسات، گرمی کا موسم، صبح کی آمد، وغیرہ وغیرہ ہیں۔

اس اصلاح وتزئین کی وجہ سے انگریزی ادب کی نظمیں تھیں جو براہ راست اپنے موضوع اور ہئیت کے اعتبار سے عوام کے دلوں کو چھو لیتی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک کوشش انگریزی نظموں کو اردو میں منتقل کرنے کی بھی رہی ہے جس سے آزادی گفتار کی راہ ہموار ہوئی اسی سلسلہ کی ایک کڑی علامہ اقبال کی نظم شکوہ اور جواب شکوہ کہی جاسکتی ہے، اس انقلاب نے عوام کے ذہن وفکر میں تبدیلی کی قندیل روشن کردی، مگر تبدیلی کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہر بات کی نقل اتاری جائے چنانچہ دیکھا گیا کہ بعض شعراء نے جہاں تبدیلی کا خیر مقدم کیا وہیں انگریزوں کی کورانہ تقلید کا بھی برا مانا اس خیال کے سب سے بڑے مبلغ اکبر الہ آبادی نظر آتے ہیں۔

9.2.1 اردو کی جدید شاعری کی بنیاد رکھنے والے محمد حسین آزاد تھے، جنہوں نے اردو شاعری کی فرسودہ اور روایتی غزل کے مقابلے نظم کو ترجیح دی اور نظم کو زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے وقف کر دیا اور یہ ثابت کیا کہ نظم سے کئی ایک کام لئے جاسکتے ہین، اگست ۱۸۴۷ء میں انہوں نے اپنی ایک تقریر میں اردو نظموں والی شاعری جسے ادبی اصطلاح میں جدید شاعری کا نام دیا گیا یہ بتایا کہ ہماری روایتی شاعری اپنے اندر کتنے نقائص رکھتی ہے، جبکہ شاعری انسانی زندگی اور فطرت کے سبھی اجزاء کو شامل کرنے کا نام ہے، ہماری شاعری محدود ہوتے ہوئے اس سے وہ کام نہیں لیا جارہا ہے، جو لیا جانا چاہیئے، ہماری شاعری ہماری زندگی کے مسائل حل نہیں کر رہی ہے، ہمارے شعراء کو اپنی کال کوٹھری سے باہر آنا چاہیےء اور نئی فضا میں نئی دنیا سے روشناس ہونا ہے۔

چنانچہ آزاد نے مئی ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی اور اس کے پرچم تلے ایک یادگار مشاعرہ کروایا جس میں روایتی طرحی مشاعرے سے ہٹ کر موضوعات کی بنیاد پر نئی نظمیں سنائی گئیں، مولانا نے اس مشاعرہ میں جو یادگار تقریر کی اس کا خلاصہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستانی شعراء کو اپنی شاعری میں مقامی رنگ اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور جذبہ حب الوطنی پیدا کرنے ہی سے ہمارے مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے، ہمارے شعراء کو گنگا و جمنا کا ذکر کرنا ہوگا، دجلہ و فرات کو بھولنا ہوگا، ارجن اور بھیم کا ذکر کرنا ہوگا، رستم و افراسیاب کو بھولنا ہوگا، چمپا اور چنبیلی کا ذکر کرنا ہوگا، لالہ و سمن کو بھولنا ہوگا۔

مولانا محمد حسین آزاد کے ان خیالات کے مولانا حالی سے سب سے زیادہ گرویدہ تھے چنانچہ انہوں نے بھی اس انجمن میں شریک ہو کر سماجی اصلاحات سے متعلق کئی ایک نظموں کو پیش کیا ان دونوں کا یہ طرز تحریر اور نیا تجربہ لوگوں نے بہت پسند کیا، اور لوگوں نے پرانے طرز کو خیر باد کہتے ہوئے جذبہ حب الوطنی اور قومی خیالات کو پیش کرنا اپنا لائحہ عمل بنالیا، اسی وقت مولانا محمد حسین آزاد کی نظموں کا ایک مجموعہ نظم آزاد کے نام سے شائع ہوا۔ اردو میں سرسید تحریک ایک اہم باب ہے سرسید کے خیالات سے مولانا حالی پوری طرح متفق تھے، سرسید نے حالی سے مسدس لکھوائی جو مدوجزر اسلام کے نام سے مشہور ہے۔

حالی سرسید کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں اپنی جدید نظمیں سنایا کرتے،

جنہیں لوگ بہت پسند کیا کرتے تھے، اس طرح حالی کو اردو ادب میں کافی شہرت نصیب ہوئی۔ حالی کی مناجات بیوہ اس کانفرنس کے یادگار جلسوں کی دین ہے، جس میں انہوں نے ہندوستانی سماج میں ایک بیوہ کی بے بسی اور بے کسی کی عمدہ تصویر کشتی کرتے ہوئے بیوہ عورت کی زندگی میں دوبارہ بہار لانے اور اسے بھی ایک انسان کے حقوق دینے کی پرزور سفارش کی۔

حالی نے اپنی طویل نظموں کو علیحدہ شائع کرتے ہوئے اسے مجموعہء نظم حالی کا نام دیا حالی نے اپنی تصانیف کے مقدموں میں اپنے مقاصد کی خوب خوب وضاحت کی۔ حالی کی مشہور نظمیں یوں ہیں، مناجات بیوہ، برکھا رت، حب وطن، چپ کی داد، تعلیم کی اہمیت وغیرہ غرضیکہ حالی نے اپنی نظموں سے ملک میں اور خصوصاً مسلمانوں کے متوسط طبقے میں ایک نئی بیداری لانے کی مہم کا بیڑا اٹھایا تھا، جو صرف اصلاح پسندی کے جذبے کی نمائندگی کرتا تھا۔

حالی شاعری کے ذریعہ بیداری کا پیغام دینا چاہتے تھے، کیونکہ شاعری حالی کے دور تک محض تک بندی اور لفظی گورکھ دھندا بن چکی تھی۔ روایت پسندوں نے حالی کے اس اقدام پر بڑے رکیک حملے کئے اور اپنی طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا، مگر حالی اپنے دھن کے پکّے اور سماجی اصلاح کے علمبردار تھے، بھلا اپنی اصلاحات سے وہ کب باز آنے والے تھے، حالی نے اردو ادب پر اپنا ایک الگ رنگ جما کے چھوڑا۔

9.2.2 جدید نظموں کی خصوصیات :

قدیم اردو شاعری میں زندگی اور اس کے تعلقات پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی، کبھی کبھی کسی غریب کے حالات یا کسی بے کس و بے بس شخص کے حالات ذکر کر دیئے جاتے تھے، اور جب جدید شاعری کا آغاز ہوا شروع شروع میں اس شاعری نے بھی قوم کی بے بسی اور افلاس پر کوئی توجہ نہ دی، بعد میں اور جب وطن میں باقاعدہ سیاسی تحریکات کا آغاز ہوا تو بلا اختیار مذہب و مسلک سماج کے پس ماندہ طبقات کے مسائل پر غور و خوض شروع ہوا، کسانوں اور مزدوروں کی سماجی حالت سدھارنے کے لئے شعراء نے سماجی بیداری کی تحریک چلانی شروع کی۔

ہندوستانی سماج میں مذہبی ٹھیکیداروں نے بھولے بھالے عوام کو لوٹنا صدیوں سے جاری رکھا ہے ،اس کے خلاف بھی کئی ایک شعراء نے آواز بلند کی، کیونکہ مذہب کے نام پر لوگوں کو لوٹنے والے ہر مذہب اور دھرم میں ہیں اور خود کو خدا کے محبوب اور عزیز ترین قرار دینے میں ایسا طبقہ کوئی کسر باقی نہیں رکھتا، لہٰذا ایسے لوگوں کے دام فریب میں آنے والے لوگ سماج کے مذہب و دھرم سے دوری کا واسطہ رکھنے والے لوگ ہی ہوا کرتے ہیں، ان خدائی ٹھیکیداروں کی رضامندی وخوشنودی ہی کو اپنی کل دنیا سمجھتے تھے۔

لہٰذا اس سماجی استحصال کے خلاف بھی شعراء نے اپنی آواز اٹھائی، ان شاعروں میں جوش ملیح آبادی ، احسان دانش، اور شہاب سرمدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دور اپنی ایک اور سماجی تحریک یعنی اشتراکیت کے لئے مشہور ہے، جس میں مزدوروں اور محنت کشوں کی حق طلبی کے لئے اٹھائی جانے والی آواز تھی، تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی بے بسی بھی قابل رحم تھی، اس کے سب سے بڑے داعی اور نقیب مجاز تھے۔

مگر جدید اردو شعراء نے آسمان اور اسکے تعلقات کو کھل کر پیش کیا۔ اس سلسلہ میں قابل ذکر نام علامہ اقبال کا ہے جنہوں نے آسمان کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ اس کے ستاروں اور کہکشاں کا ذکر خوبی کے ساتھ کیا، اسلامی نظریہ کے مطابق آسمان کی مخلوق فرشتوں کو بھی اپنے کلام کا موضوع بنایا، مثلاً اقبال کی نظم چاند اور تارے اس سلسلے کی مشہور نظم ہے۔

جہاں تک نظم کی ہئیت کا سوال ہے اس میں بھی شعرائے جدید نے نت نئے تجربے کرتے ہوئے شعر کی بحروں اور ردیف وقوافی کو بھی اپنے انداز میں برتا اس طرح انگریزی نظم کی نقل اتاری گئی اور اردو نظم کو سانیٹ مُس ڈھالنے کی کوشش ہوئی۔ جہاں غالب کی شاعری میں فارسی زبان کی کثرت تراکیب ملتیں وہیں بعض شعراء نے ہندی زبان کی آمیزش بھی روا رکھی۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز سے جدید نظم کو استحکام اور عروج ملا۔ یعنی اردو نظم میں مواد اور ہئیت کے تجربے ہونے لگے۔ انگریزی نظم کے انداز میں اردو نظم لکھی جانے لگی، پہلی جنگ عظیم کے بعد عوام میں حریت وآزادی کے جذبے پنپنے لگے اور اردو نظم کو ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی کا ترجمان بنایا گیا اور کسی نے بحر کی پابندیوں کے ساتھ انگریزی نظم اور سانیٹ مقبول بنایا۔ ان میں نظم طباطبائی، جوش عظمت اللہ خان، اختر شیرانی، سلیم پانی پتی،

چکبستؔ، اقبالؔ، سیماب اکبرآبادیؔ، نوبت رائے نظرؔ، ظفر علی خاںؔ، درگا سہائے سرورؔ، صفی لکھنویؔ، تلوک چند محرومؔ، حفیظ جالندھریؔ، افسر میرٹھی، فراقؔ، روش صدیقی، ساغر نظامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پھر 1935ء کے بعد ادبی تحریک شروع ہوئی۔ یعنی ترقی پسند تحریک اور مغرب کی جدید معاشی وسیاسی تحریکات سے نظم کے موضوعات اور ہیئتی مزاج میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ زبان وقواعد کے اصول توڑے گئے، اقبالؔ، جوشؔ کی کوششوں سے نظم اس قابل ہوگئی کہ وہ ہر طرح کے سماجی وفکری مسائل کو پیش کر سکے۔ یہاں موضوع مواد ہئیت اسلوب خیال ہر اعتبار سے نظم میں وسعت جامعیت و گہرائی پیدا ہوگئی۔ ان شعراء میں مجازؔ، فیض احمد فیضؔ، جذبیؔ، سردار جعفریؔ، ساحر لدھیانویؔ، مخدومؔ، ن۔م۔ راشدؔ، میراجیؔ، جاں نثار اخترؔ، سلام مچھلی شہر دامق جونپوریؔ، خلیل الرحمٰن اعظمیؔ، اختر الایمانؔ وغیرہ نے اپنے عہد کے مختلف مسائل اور اس سے پیدا ہونے والی دیگر تبدیلیوں کو اپنا موضوع تحریر بنایا، مذکورہ شعراء کے علاوہ اور بھی ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے مواد ہئیت اور تعمیری ساخت کے لحاظ سے اردو نظم کو مغربی شاعری کے رنگ وآہنگ میں ڈھالا اور نت نئے تجربے کئے۔

غرض یہ کہ اردو میں جدید نظموں کے دور نے اردو ادب کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتے ہوئے اپنے موضوعات اور لب ولہجہ میں کئی ایک ندرتوں کو جنم دیا، جو ایک ادب کے لئے نہایت ضروری ہے، اردو ادب کو عالمی ادب کے صف میں لا کھڑا کرنے کے لئے ان تمام ایجادات کا سہارا وقت کی اہم ضرورت تھی جسے مختلف شعرائے اردو نے حسب توفیق سنبھالا اور بڑھاوا دیا۔

اپنی معلومات کی جانب اور نمونہ جواب :

سوال ۱: اردو میں نظم نگاری کی خصوصیات قلمبند کیجئے۔

سوال ۲: جدید نظموں کی خصوصیات بتائیے:

سوال ۳: انجمن پنجاب لاھور کے مشاعرے کی اہمیت پر روشنی ڈالئے۔

جواب کے لئے 9.2، 9.2.1، 9.2.2 کے تحت دیکھئے:

9.3 فیض احمد فیضؔ: حیات اور شاعری :

ترقی پسند شعراء کی صف اولین کے ایک قابل قدر شاعر ہیں فیض احمد فیضؔ ان کی پیدائش ۱۳، فروری، ۱۹۱۲ء کو پاکستان کے مشہور شہر سیالکوٹ میں ہوئی۔ ان کا خاندانی نام فیض احمد خان ہے۔ ادبی دنیا میں فیض احمد فیض کے نام سے مشہور ہوئے۔ فیض کے والدین کی کل اولاد چار لڑکے اور پانچ لڑکیوں میں یہ دوسرے ہیں ۱۹۱۵ء میں خاندانی رسم ورواج کے مطابق حفظ قرآن مجید سے تعلیم کا آغاز ہوا ۱۹۱۶ء میں مولوی ابراھیم سیالکوٹی کے مدرسہ میں داخل ہوئے، اور ابتدائی تعلیم اردو، فارسی اور عربی حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۱ء میں اپنے ہی شہر سیالکوٹ کے اسکاچ مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخلہ لیا، اور تقریباً ہر سال امتیازی حیثیت سے تمام امتحانات میں کامیابی حاصل کی، حتی کہ ۱۹۲۷ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کامیاب رہے ۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس ہوئے۔ اسی دوران علامہ اقبال کے فارسی کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے عربی اور فارسی میں کمال حاصل کیا ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور عربی میں بی اے آنرز کے امتحانات پاس کیئے ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا، ۱۹۳۴ء مُس عربی میں اورینٹل کالج سے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۳۵ء میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر بنے، پانچ سال بعد ۱۹۴۰ء میں کالج آف کامرس میں انگریزی کے لیکچرر بن گئے، ۱۹۴۲ء میں بحیثیت کیپٹن فوج میں ملازمت اختیار کی، اور لاہور سے دلی منتقل ہوئے، اس وقت غیر منقسم ہندوستان میں شعبہء تعلقات عامہ میں خدمت پر مامور ہوئے ایک سال بعد فوج میں میجر بنے اور لفٹنٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ ۱۹۴۷ء کو ملازمت سے استعفیٰ دیا اور لاہور واپس ہوئے۔ اور 1936ء ترقپ پسند ادبی تحریک میں خوب حصہ لیا۔

9.3.1 ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری بنے اور جون ۱۹۶۲ء اسی عہدے پر قائم رہے۔ اس دوران لندن آتے جاتے رہے، ۱۹۶۴ء میں لندن سے واپس آکر مستقل طور پر کراچی کو اپنا مسکن بنالیا، جہاں یہ عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

جہاں تک فیض کی ادبی خدمات کا تعلق ہے اس کی تفصیل یوں ہے:

۳۹۔۱۹۳۸ء میں ماہنامہ ادب لطیف، لاہور کے مدیر ہوئے۔

۵۸۔۱۹۴۷ء پروگرس پیپرس لمیٹیڈ کے تحت شائع ہونے والے مشہور رسالے خصوصاً روزنامہ "ٹائمز پاکستان" روزنامہ "امروز" اور ہفت روزہ "لیل ونہار" کے مدیر اعلیٰ رہے۔ لوٹس ٹائمز (انگریزی) وغیرہ کی ادارت کی، "سویت یونین" نے انعام بھی دیا، انکی ادب وصحافتی خدمات کو دیکھتے ہوئے روس کا لینن امن انعام وخطاب بھی ملا۔

۱۹۴۱ء میں لندن نژاد خاتون ایلس جارج سے شادی ہوئی، فیض کی والدہ نے اپنی بہو کا نام کلثوم رکھا۔ اس شادی سے ان کی دو لڑکیاں، ۴۲ء، اور ۴۵ء میں ہوئیں جن کے نام سلیمہ اور منیرہ ہیں۔

۱۹۵۱ء میں مارچ کی نو تاریخ کو پہلی بار راولپنڈی سازش کیس کے تحت چار سال گیارہ دن تک پاکستان کی مختلف جیلوں میں جن میں سرگودھا منٹگمری حیدر آباد اور کرامی چامل ہیں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے آخر کار ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے۔ دوسری مرتبہ سیفٹی ایکٹ کے تحت ۱۹۵۷ء میں گرفتار اور اپیرل ۱۹۵۹ء میں رہا ہوئے۔ دوسری مرتبہ سیفی ایکٹ کے تحت 1958ء میں گرفتار ہوئے اور اپریل 1959ء اپریل میں رہا ہوئے۔

جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہوئے اور ملک وقوم کی خوب خدمات انجام دیں اور کئی بار جیل گئے اور سزا کے دوران کڑی پابندیاں عائد تھیں، بغیر چوں چرا کئے مصیبتیں سہتے تھے، مختلف ممالک کی سیر وسیاحت بھی کی اور 1984ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

۳۹۔۱۹۳۸ء کے دوران فض کے کئی ریڈیائی ڈرامے لاہور سے نشر ہو کر کافی کامیاب ہوئے، جن میں قابل ذکر "توہین عدالت"، "پرائیویٹ سکریٹری"، "سانپ کی چھتری"، اور "تماشا مرے آگے"، وغیرہ ہیں۔ پرائیویٹ سکریٹری، لاہور کے مشہور رسالہ ادب لطیف میں شائع ہوا۔

شاعری میں فیض کی ادبی خدمات کا ماحصل درج ذیل نظم ونثر کے مجموعے ہیں جن سے انکی فطری صلاحیت اور فنکارانہ خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔	نقش فریادی	۱۹۴۱ء	۷۔شام شہر یاراں- 1974
۲۔	دست صبا	۱۹۵۳ء	۸۔مرے دل مرے ساخر- 1982
۳۔	زندان نامہ	۱۹۵۶ء	
۴۔	دت تہ سنگ	۱۹۵۶ء	
۵۔	میزان (مضامین)	۱۹۴۲ء	
۶۔	سرِ وادیٔ سینہ	۱۹۷۱ء	

اس کے بعد انکے کلام کو مختلف عنوانات کے تحت کلیات کی صورت میں شائع کروایا گیا، ان میں سخن بہار حرف حرف، سارے سخن ہمارے، غبارِ ایام، نسخہ ہائے وفا وغیرہ۔

نثر میں میزان (مضامین) ۲۔ صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط کا مجموعہ) ۳۔ متاع لوح و قلم ۴۔ مہ و سال آشنائی ۵۔ ہماری قومی ثقافت ۶۔ سفر نامہ: کیوبا وغیرہ یادگار ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

سوال ۱: فیض کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالئے۔

سوال ۲: فیض کے شعری مجموعوں کے نام بتائیے۔

جواب کے لئے: 9.3، 9.3.1 اور، 9.3.2، 9.3.3، 9.3.4 کے تحت دیکھئے۔

9.3.2 شاعری :

ترقی پسند ادبی تحریک نے اردو ادب کو جو نگینے دیئے ان میں سے ایک چمکتا ہوا نگینہ فیض احمد فیض ہیں ان کی تابانی نے ایک سارے عہد کو متاثر کیا، مختلف شعراء و ادباء نے فیض کے اس فن کو سراہا، اور اسے اردو ادب میں ایک سنگ میل قرار دیا، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فیض نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعہ اردو ادب کو ایک نیا موڑ ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ ایک ہم عصر ادیب کا کہنا

ہے کہ "فیض زمانہء حال میں اردو کے صف اول کے شاعر ہیں، وہ نہ صرف ایک نئے طرز فکر اور طرز ادا کے موجد ہیں، بلکہ ان کی ادائیگی میں بھی انہیں کمال حاصل ہے، انکے اشعار میں یاسیت ضرور ہے مگر ساتھ ہی حقیقت کی تلخی بھی، غزل کی شیرینی اور لطافت بھی شامل ہے، جو ان کے کلام کو دل کے نہاں خانوں تک لے جاتی ہے۔

فیض کے کلام میں ایک مخصوص علامتی انداز نرم و پرسوز لہجہ اور ساتھ ہی ساتھ تہہ دار تشبیہات و استعارات ملتے ہیں۔ اور نیا وجدان تازہ لب ولہجہ ملتا ہے، فیض کے کلام میں ایک انقلابی اضطراب کے اثرات نمایاں طور سے دکھائی دیتے ہیں، وہ اپنے وطن کے سچے اور پر خلوص وفادار سپاہی ہیں، سماج کے ٹھیکیداروں سے از حد نالاں نظر آتے ہیں۔ وہ ایک سچے ترقی پسند ادیب وشاعر ہونے کے ناطے حق داروں کے حقوق کے لئے لڑنے مرنے اور ستم دار ورسن تک کو سہنے کے لئے نہ صرف فکری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی تیار نظر آتے ہیں، سماج کا دکھ ان کا ذاتی دکھ بن جاتا ہے، وہ معصوم عوام کو زندگی کے مصائب وآلام سے دور ایک پر مسرت زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیاں چلنے والی جنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔

9.3.3. روزنامہ "جنگ" میں سید محمد تقی فیض احمد فیضؔ کے بارے میں لکھتے ہیں

"ادبی مقام، شاعرانہ بلند پروازی اور نظریاتی بلوغ سے قطع نظر اگر انہیں محض ایک انسان کی حیثیت سے تولا جائے تو وہ انسانوں کی اس نسل میں نظر آئیں گے، جو خانقاہی اخلاق کا ورثہ لیکر زندگی گزارنے کے نظریہ پر مبنی چلتی ہے۔ انہیں بآسانی دھوکہ دیا جاسکتا ہے، لیکن وہ مزاج کے ان تشکیلی عناصر سے محروم ہیں جو چلت پھرت، داؤ پیچ اور تہہ دار کردار کی تخلیق کا سبب بنتے ہیں"

اردو اور ہندی کے مشہور ادیب وشاعر ملک راج آنند نے ایک جگہ فیض پر یوں تبصرہ کیا تھا،

"میں ان تمام مشاعروں میں موجود تھا، جہاں فیض نے اپنی غزلیں پڑھیں، اور

مجھے احساس ہوا تھا کہ اپنی محبت کے اظہار میں فیض کا شعور بہت پختہ تھا۔ اس کے الفاظ کہیں زیادہ پرخلوص محسوس ہوئے ان گھسے پٹے الفاظ اور جملوں کے مقابلے میں جو اردو کی روایتی شاعری میں آج تک سنائی دیتے رہے ہیں، جذبات کی ترجمانی میں سچائی اور خلوص کی ایک ایسی کھنک تھی جو سننے والوں کے دلوں کو چھو لیتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان و پاکستان آزاد ہو گئے آزادی کے فوراً بعد انسانیت سوز اور شرمناک فسادات کی آگ پھیل گئی جن سے فیض کی روح لرز گئی، اس نے ہمیں ایسے نوحے سنائے جن میں زخم خوردہ انسانیت کا ماتم تھا، اس کی شاعری اب اس شعلہ کی مانند تھی جو غم والم کی ٹھنڈی راکھ سے ابھرتا ہے، اور خود جلتا ہوا پڑھنے والے کے دل میں ان کے جذبات کا خیال کئے بغیر در آتا ہے۔

فیض نے ملک کی آزادی کے جو خواب دیکھے تھے، اور آزاد ملک میں جس خوشحالی اور شادابی کے سپنے دیکھے تھے وہ انہیں شرمندہ تعبیر ہوتے ہوئے دکھائی نہیں دئے اس لئے وہ چیخ پڑے کہ ہم نے ایسی آزادی کے خواب ہرگز نہیں دیکھے تھے، یہ آزادی تو خون کے آنسو رلانے والی آزادی ثابت ہوئی ، یہاں غریب مزید غریب تر ہوتا جا رہا ہے، اور افسر شاہی حکومت ظلم وستم کی ایک اور ہی تصویر پیش کر رہی ہے، ان کی مشہور نظم "یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر،" ان کے جذبات واحساسات کی سچی ترجمانی ہے۔ ایک حساس دل ودماغ والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ داغ داغ اجالہ یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

9.3.4 راولپنڈی سازش کی تفصیل :

فیض کی زندگی کا ایک اہم واقعہ راولپنڈی سازش کیس میں ان کی گرفتاری اور قید و بند کی صعوبتیں ہیں، جنہوں نے ان سے لازوال نظمیں لکھوائیں، سرگودھا اور لائلپور کی اسیری کے دوران

فیض کو جیل خانے میں کاغذ و قلم نہیں دیئے گئے، مگر ارباب وطن ان کی سوچ اور فکر پر تالے یا ہتھکڑی نہیں لگا سکے، چنانچہ ان کی مشہور زمانہ نظمیں "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، "ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے"، وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

؎ متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے ☆ کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

؎ ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے ☆ جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں فیض گرفتار کر لئے گئے، مشہور ترقی پسند شاعر سجاد ظہیر بھی گرفتار ہوئے، اور کئی دوسرے فوجی غیر فوجی افسر بھی، فیض کو چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، تین مہینے قید تنہائی کی سزا ہوئی، (جو ناکردہ گناہوں کی سزا تھی)، اسی پر فیض نے کہا تھا کہ: "یہاں پر نہ کچھ لکھنے، لکھانے کی اجازت تھی نہ باہر کی دنیا سے واسطہ، ملنے ملانے پر بھی پابندی تھی"، تب شاعر نے کہا

؎ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں ☆ وہ بات انکو بہت ناگوار گذری

؎ زباں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ☆ ہر ایک حلقہ زنجیر میں زبان میں نے

فیض نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، فیض کو بچپن سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور طالب علمی کے ہی زمانے میں انکی یہ فطری صلاحیت نکھرنے لگی تھی، اور باقاعدہ شعر کہنے لگے، اچھے اساتذہ سخن کی صحبت حاصل تھی، ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن رہے، اور اسکے فروغ میں خوب حصہ لیا، رجائی شاعر تھے، اشتراکیت کی طرف زیادہ رجحان رہا، آپ بیتی و جگ بیتی کا حسین امتزاج انکے یہاں ملتا ہے، ان کے یہاں احساس کی شدت اور جذبہ کی تاثیر خوب ہے، رومان و حقیقت یعنی غم جاناں و غم دواں کا ذکر ملتا ہے، فیض کا زیادہ تر کلام محبوب کے انتظار مسلسل انتظار پر مشتمل ہے، اور پھر یہ محبوب کا انتظار چمکتی ہوئی سحر کے انتظار میں بدل جاتا ہے۔ جس کی بہترین مثال آپ کے نصاب میں شامل نظموں میں ملتا ہے، فیض کی شاعری میں محبوب کے انتظار میں خواب گوں کیفیت غنائی لہجہ مناسب اور ڈھلے ڈھلائے الفاظ، اچھوتی اور نادر تراکیب سب کچھ ہیں، فیض کی شاعری میں عوامی

مزاج بھی پایا جاتا ہے۔ ہجر و وصال کا روایتی لب ولہجہ بھی ہے، نئے تشبیہات، نئے استعارات، نئی علامات و کنایات کو عصری تقاضوں کی روشنی میں استعمال کیا ہے، لفظ و معنی کے اعتبار سے کئی جہات رکھتا ہے، بہر حال انکا جو کچھ بھی ادبی سرمایا نظم و نثر میں ہے وہ ادب کے لئے نہایت ہی گرانقدر اور وقیع سرمایا ہے اور اردو شاعری کے ارتقاء میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

9.4 خلاصہ :

اس اکائی میں دو اہم عنوانات کے تحت تفصیل دی گئی ہے ایک اردو میں نظم نگاری کی خصوصیات اور فیض احمد فیضؔ کی حیات اور شاعری سے متعلق معلومات فراہم کئے اغراض و مقاصد کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں جانکاری حاصل کی آپ کے علم میں یہ بات آ گئی کی فیض کی حیات اور شاعری اردو نظم کی خصوصیات وغیرہ کے لحاظ سے نظم نگاری کی خصوصیات اور فیض احمد کی حیات کے اہم گوشوں کے علاوہ بھی اردو ادب میں انکی امتیازی حیثیت انکی ادبی خدمات سے بھی آپکو واقف کروایا۔ اور فیض احمد فیض کی حیات اور شاعری سے۔ اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی، آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا، توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

9.5 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ ثابت کیجئے کہ غزل کے مقابلے میں نظم سماجی مسائل حل کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہوئی۔

۲۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے نظم کو کس طرح بڑھاوا دیا اور کیوں؟

۳۔ مولانا حالی کی نظموں یں سے کی ایک نظم کی سماجی اہمیت واضح کیجئے۔

۴۔ نظم کو مقدم کرنے کے لئے کونسے سماجی حالات ذمہ دار تھے، تفصیل لکھئے۔

۵۔ فیض احمد فیض کی حیات کے اہم گوشوں کو اجاگر کیجئے۔

۶۔ فیض احمد فیض کی شاعری کی خصوصیات رقم کیجئے۔

۷۔ فیض کا سوانحی خاکہ پیش کیجئے۔

۸۔ حیات فیض پر ایک نوٹ لکھئے۔

9.6 فرہنگ :

لفظ	معنی	لفظ	معنی
زینہ	سیڑھی	ہمنوا	ہم خیال
بقاء	باقی رہنا، قائم رہنا	وضع قطع	ڈھب، انداز
برکھارت	برسات کا موسم	رجحان	انداز فکر، میلان
اجاگر	واضح، نمایاں	کدوکاوش	محنت، تگ ودو
تزئین	سنوارنا	آزادیٔ گفتار	بات کرنے کی آزادی
قندیل	لالٹین، چراغ	مبلغ	تبلیغ کرنے والا، عام کرنے والا
نقائص	نقص کی جمع، کمی، خرابی	جذبہ حب الوطنی	وطن سے محبت کرنے کا جذبہ
دجلہ وفرات	عراق کے دو مشہور دریا	رستم وافراسیاب	ایران کے دو مشہور پہلوان
مدوجزر	اتار چڑھاؤ، نشیب وفراز	لفظی گورکھ دھندا	بے کار الفاظ کا کھیل
طنز وتشنیع	تنقیدی کلمات	خدائی ٹھیکیدار	[مذہب کے نام پر لوگوں کو لوٹنے والے]
دام فریب	دھوکہ دینے کیلئے استعمال ہونے والی جال		
ندرت	جدت، نیاپن،	فرض منصبی	ذمہ داری
شعبۂ تعلقات عامہ	پبلک ریلیشن سیکشن	مسکن	ٹھکانہ

لندن نژاد	لندن کی نسل	سیفٹی ایکٹ	حفاظتی دفعہ
صعوبتیں	تکالیف، مشکلیں	صحافتی خدمات	اخبار کی ملازمت
مُوجد	ایجاد کرنے والا	تلخی	کڑواہٹ
نالاں	بےزار	دارورسن	پھانسی کا تختہ اور رسی
آلام	الم کی جمع، دکھ رنج	نظریاتی بلوغ	[ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے نظریات کو پیش کرنا]
داؤ پیچ	مکروفریب	کھنک	آواز، دلفریب آواز
وقیع	نہایت قدر و قیمت والی چیز		

9.7 سفارشی کتب :

۱۔	آج کا اردو ادب	ابواللئیث صدیقی
۲۔	نئے ادبی رجحانات	سید اعجاز حسین
۳۔	چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی
۴۔	معاصر ادب کے پیش رو	محمد حسن
۵۔	افکار (فیض نمبر)	کراچی، 1965ء
۶۔	مطالعہ فیض	اشفاق حسین
۷۔	فیض احمد فیض (فن اور شخصیت کا خصوصی شمارہ۔)	ترتیب، صابر دت
۸۔	نسخہ ہائے وفا	کلیات فیض

شیخ عطاء الرحمٰن ، لیکچرر، گورنمنٹ کالج، سری رنگ پٹنہ

اکائی۔۱۰ : فیض احمد فیض کی نظمیں اور تشریح

(مجموعہ:"نقش فریادی": کی منتخب نظمیں)

ساخت :

10.0 اغراض ومقاصد

10.1 تمہید

10.2 فیض احمد فیض کے مجموعہء "نقش فریادی" کا تعارف

10.3 نظم i تنہائی (متن)

10.3.1 تشریح

10.4 نظم ii کتے (متن)

10.4.1 تشریح

10.5 نظم iii :چند روز اور میری جاں (متن)

10.5.1 تشریح

10.6 نظم iv :مجھ سے پہلی سے محبت مرے محبوب نہ مانگ (متن)

10.6.1 تشریح

10.7 عمومی جائزہ

10.8 خلاصہ

10.9 نمونہ امتحانی سوالات

10.10 فرہنگ

10.11 سفارشی کتب

10.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ سے امید کی جاتی ہے کہ آپ فیضؔ کے کلام کو مکمل طور پر سمجھ سکیں۔فیض کی نظموں کے ہر شعر کو معنی و مفہوم کے ساتھ ادا کرنے کے قابل بن جائیں۔اردو شاعری کی نزاکتیں اور انداز بیان سے واقف ہوسکیں گے،فیضؔ کے بیان کے انداز سے واقف ہوسکیں گے، فیض کا انداز بیان جو کہ جدید و قدیم اردو کا ایک انوکھا سنگم ہے جان سکیں۔

10.1 تمہید :

اس اکائی میں فیض کے مجموعہء کلام "نقش فریادی" سے چار نظمیں لی گئی ہیں اس اکائی میں ہر ایک نظم کی تشریح اس کے متن کے ساتھ پیش کی جائیگی، جیسا کہ آپ جانتے ہیں فیض احمد فیضؔ ترقی پسند تحریک کے صف اول کے شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔اور وہ اردو ادبی دنیا میں اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ان کی ہر ایک نظم اپنے مضمون اور موضوع کے اعتبار سے اچھوتی۔معنی و مفہوم کی ادائیگی میں جدّت و ندرت بھی ہوتی ہے۔

10.2 فیض احمد فیضؔ کے مجموعہء کلام نقش فریادی کا تعارف :

فیض احمد فیضؔ کا کلام مختلف عنوانات کے تحت کلیات کی صورت میں شائع ہوا ان میں سارے سخن ہمارے، حرف حرف، غبارِ ایام، سخن بہار، نسخہء ہائے وفا، ان میں "نسخہء ہائے وفا" کو فیض احمد فیض کا مکمل کلیات قرار دیا جاتا ہے، جس میں ان کا سارا کلام یکجا ہوا ہے۔

پہلا شعر ۱۹۲۸ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی ادبی تنظیم "اخوان الصفا" کے پہلے طرحی مشاعرے کے لئے فیض نے جو غزل کہی اس کا پہلا شعر تھا،

؎ لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے ﴿ وہ جام جو منت کش مہیا نہیں ہوتا۔

یہ شعر بے حد مقبول ہوا اور اسی مشاعرے سے فیض کی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔

"نقش فریادی" فیض کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس کی اشاعت ۱۹۴۱ء میں عمل میں آئی۔ اس میں طالب علمی کے زمانے سے ۱۹۴۱ء تک کا کلام موجود ہے، اس میں زیادہ تر رومانی نظمیں ہیں۔ فیض کا یہ ایک اہم مجموعہ ہے لیکن اس کے مطالعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں شامل نظموں غزلوں کا سنہ تصنیف کیا ہے، البتہ فیض نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی رکھی ہے جس طرح وہ لکھی گئیں۔ "نقشِ فریادی" میں زیادہ تر رومانی نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کی تقریباً ساری نظموں میں فیض کا لہجہ مانوس ہے، زبان، سادہ، سلیس، شیرین اور آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے۔ زبان میں لوچ اور نرمی نے ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے، پھر خلوص کی گرمی ہر جگہ ہے۔ فیض کے کلام میں کہیں جھنجھلاہٹ، نفرت اور حقارت نہیں بلکہ دردمندی، غم ناکی، تڑپ اور بے چینی ہے، اور غم بھی کیسا کہ مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے۔ یہ ہمارے دل میں بھی اترتا جارہا ہے۔ "نقش فریادی" کے مقدمہ میں ن۔م۔ راشد نے لکھا ہے کہ "فیض کسی مرکزی نظریہ کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے"

لیکن فیض کا کلام پڑھنے سے اس کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ "نقش فریادی" کی نظموں میں اپنے آس پاس کے درد و غم کی زندگی کا احساس ہی نہیں اس کا ذہنی شعور بھی موجود ہے۔ اور فیض اپنے عوام کے مسائل کو صرف محسوس ہی نہیں کرتے، ان کے حل کی سمت اشارہ بھی کرتے ہیں اور جہاں تک مرکزی نظریہ کا تعلق ہے "نقش فریادی" پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ زندگی سے متعلق فیض کا ایک متعین نقطۂ نظر ہے، ان کا تصورِ حیات ان کے ذہن کی پیداوار نہ سہی لیکن جس تصورِ حیات سے وہ خود کو وابستہ رکھتے ہیں وہ ان کی شاعری کو ایک مرکزی نظریہ ضرور بہم پہنچاتا ہے "نقشِ فریادی" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، غزلیں (۱۲)، نظمیں (۳۱) اور قطعات (۴)۔ "نقش فریادی" میں غزلوں اور نظموں کو ساتھ ساتھ دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے اپنی شخصیت اور شاعری کو ان دونوں اصناف میں بانٹ دیا ہے، نظم میں انہوں نے غم زمانہ اور عوام کے دکھ درد کی ترجمانی کی ہے تو غزل کو اپنے ذاتی غم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے غزل کی کتنی ہی

مخالفت کی ہو فیض نے غزل سے اپنے یارانہ برقرار رکھا۔ ویسے 'نقش فریادی" میں ان کی کئی ایک اچھی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں "تنہائی"، "موضوعِ سخن" چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز"، رقیب سے، "کتے"، "ہم لوگ"، "سوچ" مرے ہمدم مرے دوست"، "خدا وہ وقت نہ لائے"، "انتہائے کار"، "سرورِ شبانہ"، "انتظار"، تہہ نجوم"، "آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ"، ایک رہ گذر، ایک منظر اور میرے ندیم کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

10.3 نظم "تنہائی" کا متن :

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائیگا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں ، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا۔

10.3.1 نظم "تنہائی" کی تشریح :

اس نظم میں تنہائی اور انتظار دونوں کو مرزکی خیال کے طور پر برتا ہے، یہاں شاعر اپنی قوم اور اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے آزادی کا انتظار کررہا ہے، اسے یقین ہے انگریز سامراج نے اپنے طور پر جو بھی کیا ہو ایک نیا سورج طلوع ہوگا ایک نیا سویرا آئیگا، اور دنیا کو روشن کرے گا۔

انسان ایک سماجی جانور (Social Animal) ہے، وہ ہمیشہ اپنے لگے بندھوں اور رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے، کبھی حالات دگرگوں ہوتے ہیں تو اسے تنہائی اختیار کرنا یا تنہائی اس کے نصیب میں ہوتی ہے تو پھر زندگی اس کے لئے ایک عذاب بن جاتی ہے، جب وہ اکیلا ہوتا ہے تو اسے ایک پتہ کے کھڑکنے سے بھی یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کوئی آرہا ہے۔ شاعر محوِ انتظار ہے اپنے سارے وجود کے ساتھ ہر آہٹ پر محبوب کے آنے کا امکان ڈھونڈھ رہا ہے کبھی یقین تو کبھی گمان۔

فیض جب قید خانہ میں تنہا تھے تو ایک حساس دل رکھنے والے شاعر کے جذبات واحساسات کیا تھے انہی کو شاعر نے اپنی اس نظم میں پیش کیا ہے، چنانچہ وہ اپنے دل سے خطاب کر کے کہتے ہیں، اے دل زار کسی کے آنے کی آہٹ سی محسوس ہو رہی ہے، پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی کہتے ہیں نہیں کوئی راہ رو ہے وہ اپنے راہ پر چلا جائیگا، میرے پاس میرا دل بہلانے کے لئے کوئی آنے والا نہیں ہے۔

ساری رات بے خوابی میں گذارنے کے بعد نا امیدی بڑھتی ہے تو شاعر کہتا ہے رات ڈھل چکی، آسمان پر ساری رات جو تارے ٹمٹمار ہے تھے وہ ایک ایک کر کے بجھتے چلے جارہے ہیں، اور گھروں میں رات بھر جو چراغ جل رہے تھے، ان کا تیل ختم ہونے کو آیا تو وہ بھی بجھا چاہتے ہیں۔ آنے والے کو آنا ہوتا تو ضرور آتا مگر کوئی نہیں آیا اس کے راہ گزرنے بھی لوگوں کے نقش قدم کو آہستہ آہستہ مٹانا شروع کر دیا ہے۔

اس نے اے رات کے مکینو! اب کوئی تمہارا منتظر نہیں اور نہ تم کسی کا انتظار کرنا، چراغوں کو بجھا دو، اور رات گذارنے کے لئے مئے و مینا کا جو اہتمام ہوا تھا ان سب کو اٹھا دو، ذہن و دماغ کے کواڑوں کو بند کر لو کیونکہ اس میں نیند نہ ہونے کی وجہ سے کوئی خواب بھی دکھائی دینے والا نہیں ہے۔ اس لئے ان کو بند کر لو نہ حقیقت میں اور نہ ہی کوئی خواب میں تمہاری تنہائی دور کرنے والا آئیگا۔ بہر حال الفاظ کی نشست و برخاست بھی کچھ ایسی ہے کہ شاعر کی دلی کیفیت کی بہ تمام وکمال عکاسی ہوتی ہے، بارہا اسے کھویا اور بارہا اسے پایا کی طرح اپنی ذات اور احساسات کو پاتا ہے، نظم کے منتخب الفاظ سے شاعر کی فنکارانہ صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ اور نمونہ جواب :

سوال ۱: فیضؔ کی نظم تنہائی کا خلاصہ کیجئے۔

سوال ۲: فیضؔ کے مجموعہ نقش فریادی کی اہمیت پونوٹ لکھئے: س

جواب کیلئے اکائی 10.2، اور 10.3.1 دیکھئے۔

10.4 دوسری نظم "کتّے" کا متن

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی
نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

10.4.1 نظم "کُتّے" تشریح

کُتّے فیض کے مجموعہ کلام "نقش فریادی" کی یہ دوسری نظم ہے، فیض نے اپنی نظم "کُتّے" میں کتّے بطور اشارہ استعمال کیا ہے، اور اس میں معنویت کی ایک دنیا سمودی ہے، یہاں کتے اشارہ ہے بے کس بے بس، مظلوم اور مجبور عوام کے لئے ساری نظم اشاریتی انداز لئے ہوئے ہے۔ اس نظم میں شاعر نے سماج میں پائے جانے والے ایک حقیر اور ذلیل جانور کو اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کی نظر صرف سماج کی اہم چیزوں کی طرف ہی نہیں بلکہ ایک غیر اہم اور قابل نفرت چیز کو بھی اپنی نظم کا موضوع بنا کر عام آدمی کو دعوت فکر دی جاسکتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ کُتّے جو گلیوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں، اور بھیک کے ٹکڑوں پر ان کا گزارہ ہوتا ہے، یہاں فیض نے "ذوق گدائی" کی ترکیب استعمال کی ہے، جو قابل توجہ ہے، علامہ اقبال نے اپنے کلام میں ایک جگہ "ذوق خدائی" کی ترکیب کا استعمال کیا ہے، وہ شعر ہے،

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے ﴿ ﴾ جنہیں تو بخشا ہے ذوق خدائی

اسی مناسبت سے فیض نے ذوق گدائی کی ترکیب برتی ہے، پھر کہتے ہیں یہ کُتّے وہ مخلوق ہیں جنہیں ہر طرف سے دھتکار اور پھٹکار ہی نصیب ہوتی ہے، کہیں بھی ان کی نہ عزت کی جاتی ہے، نہ ہی خاطر تواضع ان کتوں کا حال یہ ہے کہ نہ انہیں رات کو آرام میسر آتا ہے، نہ دن کو چین نصیب ہوتا ہے، گندی جگہ ان کا ٹھکانہ اور ان کا گھر ہوتا ہے، یہ ایک لقمہ کی خاطر اپنے ہم جنسوں سے لڑ بھڑ جاتے ہیں۔ ہر کوئی ان کو دھتکارتا ہے اور پھٹکارتا ہے، اور جب یہ اپنی عمر کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کے نصیب میں فاقہ اور بھوک مری ہی ہوتی ہے۔

فیض نے در پردہ ملک کے غریب عوام کو کتوں کی زندگی سے مشابہ قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ ان غریب بے بس و بے کس انسانوں کی زندگی بھی ان گلی کے آوارہ کتوں کی زندگی سے الگ اور جدا نہیں ہے، مگر آخری بند میں ان بے بس انسانوں کی طاقت کو امیروں اور وزیروں کے لئے خطرہ کی گھنٹی بھی ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر یہ عاجز اور مسکین کتوں کو ایک بہترین قیادت نصیب ہوجائے تو یہ اپنے آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا ڈالیں گے بس کمی اس بات کی ہے کہ ان کو ذرا جگا دیا جائے، ان کی سوئی ہوئی حس کو ذرا سی بیداری مل جائے تو یہ ماحول کو دوسرا ہی رنگ دیدیں۔

10.5 تیسری نظم "چندر وز اور مر ی جان !"

چندروز اور مری جان! فقط چند ہی رو
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پر زنجیروں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصہء دھر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دوروزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چندروز اور مری جان! فقط چند ہی روز

10.5.1 نظم "چند روز اور مری جان" کی تشریح :

نقش فریادی کی ایک اور نظم ہے، ماحول کے دکھ درد کے اثرات تو جذباتی کش مکش کے باوجود جینے کی نئی آس اور صبح امید کی نئی کرن، انسانی ہمدردی کی جوت کسی دن جاگ اٹھنے کا احساس دیا۔ شاعر اپنے محبوب سے باصرار یہ بات کہتا ہے کہ جس مقصد کو ہم لے کر اٹھے ہیں اس راہ میں دشواریاں ہی دشواریاں اور مصائب ہی مصائب ہیں، وطن کی آزادی کی خاطر ہمیں چند دن اور ان مظالم و مصائب کا پامردی ہمت اور استقلال کے ساتھ سامنا کرنا ہوگا، کیونکہ وطن کے ارباب حل وعقد کو ہماری جدوجہد اور عزائم پسند نہیں ہیں لہٰذا ظلم وستم سے کام لیکر ہمیں اپنے ارادوں سے ٹالنا چاہتے ہیں۔

لہٰذا شاعر اصرار کرتا ہے کہ چند دن اور ہم یہ ستم سہہ لیں گے تڑپ لیں گے اور ظلم حد سے گذر جائے تو تھوڑی دیر رولیں تا کہ ہمارا غم ہلکا پڑ جائے یہ سب ستم ہمیں اس لئے سہنا ہوگا کیونکہ ہماری ساری جدو جہد اس وطن کے لئے ہو رہی ہے جسے ہم نے اپنے آباو اجداد سے میراث یا ترکہ کی صورت میں پایا ہے۔

ہمارے ملک کے رہنما ہمیں قید کر رہے ہیں، ہمارے جذبات پر بندشیں لگا رہے ہیں، ہماری قوت فکر پر پابندیاں لگ رہی ہیں، اور ہماری تقریریں قابل گرفت جرم ثابت ہو رہی ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا زندہ رہنا، یہی ہماری طاقت وقوت ہے۔

ہماری زندگی کی مثال ایک غریب کی گدڑی کی طرح ہے، جس میں ہر دن کوئی نہ کوئی پیوند لگ ہی جاتا ہے، مگر ہم کو اس مصیبت کا سامنا تو کرنا ہی ہے اسلئے یہ ظلم یہ دکھ مزید چند روز سہہ لیں گے اس لئے صبر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس زمانے نے ہم پر ظلم تو ضرور کیا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ظلم سہتے ہی رہ جائیں گے، غیر لوگ ہم پر ستم پر ستم ضرور ڈھا رہے ہیں مگر یہ ہمیشہ چلنے والا نہیں ہے، اے میرے محبوب ظلم سہتے سہتے تیرا حسن اگر چہ کہ ماند پڑ چکا ہے، چاندنی رات اور اس کا حسن بے کار سا محسوس ہو رہا ہے، دل تڑپ رہا ہے مگر ہمیشہ یہی صورتحال نہ ہوگی، اس لئے اے میرے محبوب چند دن اور اس ظلم کو سہہ لے اس کے بعد جو صبح طلوع ہوگی وہ ہمارے خوابوں کی تعبیر دینے والی صبح ہوگی۔

10.6 چوتھی نظم "مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ"

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کی سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم

خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ!

10.6.1 نظم : "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ : تشریح

شاعر کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب مجھ سے پہلی سی شدید محبت کی امید نہ رکھ کیونکہ جس تصور ونظر کے ساتھ میں نے تجھ سے اپنا رشتہ استوار کیا تھا، اب وہ کافی بدل چکا ہے، ملک کے جو حالات ہیں ان کے پیش نظر میں خود کو تیری محبت میں مبتلا نہیں رکھ سکتا، اس ملک کو آزاد کرانا اب وقت کا تقاضہ ہے، اس سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو سکون امن اور چین نصیب ہوگا، اگر تیرا غم ساتھ رہے تو کافی ہے، مزید زمانے کے غم کا جھگڑے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اگر تیری صورت ہمارے سامنے باقی رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہار ہر ہمیشہ باقی رہے گی اور خوشحالی کا گمان ہوگا۔

تجھ سے عشق کرتے ہوئے میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر محبوب کا وصال ہو جائے تو اپنی تقدیر ہی بدل جائے گی مگر ایسا ہو جائے اس کی صرف چاہت تھی، محبوب کے نہ ملنے کا جو دکھ ہے صرف وہی ایک دکھ زندگی کا نہیں بلکہ اس کے سوا اور بھی دکھ ہیں جو اس سے زیادہ اہم اور سنگین ہیں۔ صدیوں سے یہ ہوتا آیا کہ انسان انسان پر مشق ستم جاری رکھتا ہے جو مالدار وزردار ہے، وہ انسان کے جسم کو جنس کی طرح خریدتا ہے اور ضرورت پڑنے پر جانوروں سے زیادہ ظلم انسانوں پر روا رکھتا ہے۔

اے محبوب! تو حسین اور دلکش ضرور ہے، تیرے چہرے پر ہماری نظر بے اختیار ضرور اٹھ جاتی ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ایک دکھ کے علاوہ دنیا میں اور بھی کئی قسم کے دکھ ہیں جن کی طرف توجہ لازمی اور ضروری ہو جاتی ہے۔ نوٹ: اندر کمار گجرال :

فیض کی شاعری کو اور سوچ کو نیا موڑ دینے میں محمود الظفر اور خورشید جہاں کا بہت ہاتھ تھا، اسی دوڑ نے ان کو کوئے یار سے نکال کر کوئے دار کا رستہ سجھایا تھا۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے ❁ وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے

بقول شخصے " پہلی محبت میں دونوں جہاں ہارنے کے بعد فیض امرتسر یم۔او۔کالج میں

انگریزی کے لیکچرر ہوئے، ڈاکٹر رشید جہاں نے فیض کی ناکامی محبت کو بھانپ لیا اور انہوں نے کہا کہ ناکامی اتنا بڑا حادثہ بھی نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے، فیض کو (کارل مارکس) کی کمیونسٹ مینی فسٹو پڑھنے کو دی، بقول فیض انہوں نے اس کتاب کو پڑھا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو چکے تھے، اور ایک نیا درد لئے شاعر کہہ اٹھا:

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

فیض کی یہ معنویت کا گلدستہ ہے، فیض کفایت لفظی سے اپنے اسلوب میں خوب کام لیا ہے اور یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے۔

10.7 عمومی جائزہ :

آپ نے فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام "نقش فریادی" کی منتخب چار نظموں کو پڑھا اور ہر ایک نظم کی تشریح بھی پڑھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر نظم اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے دوسری نظموں سے یکلخت منفرد اور جداگانہ ہے، تنہائی میں ایک اکیلے آدمی کی کیفیات کو نظم کیا گیا ہے اور کہا گیا کہ جو آدمی اکیلا ہے اسے اکیلا ہی رہنا ہوگا اس کا کوئی مونس و غمخوار نہ ہوگا، دوسری نظم کتے بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے انوکھی ہے، اس میں کتوں کی حالت زار بیان کی گئی ہے کہ وہ عوام کے بھیک کے ٹکڑوں پر زندہ رکھتے ہیں ان کا ٹھکانہ گندی نالی اور بسیرا ناپاک جگہ ہوتی ہے وہ ایک ٹکڑا روٹی کا حاصل کرنے کے لئے اپنے ہی ہم جنسوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آخر کار بھوک ہی سے ان کی زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ ایک اشاراتی نظم ہے کتے کے توسط سے انسان کی بے بسی و بے کسی اور مجبوری کا بیان ہے جو معنویت سے بھرپور ہے۔

تیسری نظم میں اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دور آزمائش میں ارباب حکومت نے ہم پر ستم کے پہاڑ توڑ دیئے، ہمارے لئے ان مظالم کا برداشت کرنا ناممکن سا دکھائی دے رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پائے ثبات میں لغزش آجائے اس لئے اپنے محبوب کو

مزید چند دن صبر وضبط اور تحمل واستقلال کی سفارش کرتے ہیں کیونکہ جس ملک کو آزاد کرانے کی ہم نے ٹھانی ہے وہ ہمارے آباء واجداد کی میراث ہے۔

چوتھی نظم میں اپنی محبوب سے گذارش کرتے ہیں کہ میں نے ابتدائے عشق میں جس طرح تجھ سے محبت کی تھی اب وہ گرمی میرے عشق میں باقی نہ رہی کیونکہ تیرا وصل ہی اس دنیا میں سب کچھ نہیں ہے اور بھی بہت سارے دکھ ہیں جو اس سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اس لئے اے میرے محبوب مجھے تیرے وصل سے زیادہ ملک کی آزادی کی صورت میں حاصل ہونے والا وصل زیادہ اہم بن گیا ہے۔اسلئے کیوں کہ:

کیوں نہ جہاں کا غم اپنالیں ﴿ بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں ﴿ سپنوں کی تعبیریں سوچیں (فیضؔ)

10.8 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپ کو فیض کے مجموعہ نقش فریادی سے چار مختلف عنوانات پر نظمیں اور انکی تشریح کے بارے میں واقف کرایا۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ آپکے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف نظموں اور ان کی تشریح سے فیض احمد فیضؔ کے نظریات وافکار کیا تھے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی، آخر میں نمونہء امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ نے معنی بھی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

10.9 نمونہء امتحانی سوالات :

۱۔ نظم "تنہائی" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

۲۔ نظم کتے میں شاعر نے کن استعاروں وتشبیہوں کا استعمال کیا ہے، بتایئے۔

۳۔ فیض کی شاعری کی اہم خصوصیات قلمبند کیجئے۔

۴۔ شاعر فیض کے کلام کے حوالے سے فیضؔ کی وطن دوستی ثابت کیجئے۔

۵۔ جذبہ غم جاناں وغم دوراں کو فیض نے اپنی نظموں میں کس طرح پیش کیا ہے اپنے الفاظ میں پیش کیجئے۔

۶۔ اچھے دن دیکھنے کی امید پر شاعر نے اپنے محبوب کو کیسے تسلی دی ہے، واضح کیجئے۔

۷۔ نقش فریادی کی کسی ایک نظم کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالئے۔ کُتّے، چند روز مری جان، تنہائی۔

۸۔ فیض کی منظومات کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیجئے۔

10.10 فرھنگ :

لفظ	معنی	لفظ	معنی

(۱) نظم "تنھائی"

دل زار	رونے والا دل	راہرو	راستہ چلنے والا، مسافر
ایوان	محل	خوابیدہ	سوئے ہوئے
دھندلانا	دھیما کرنا، میٹ دینا	سراغ	نشان
شمع گل کرنا	(محاورہ) بجھا دینا	بڑھانا	اٹھا دینا
مے و مینا	مترادف لفظ بمعنی شراب	ایاغ	پیالہ
کواڑ	پھاٹک، کھڑکی	مقفل کرنا	بند کرنا، قفل ڈالنا

(۲) کُتّے

ذوق گدائی	فقیرانہ انداز	پھٹکار	دھتکارنا، ہانکنا
فاقہ	بھوک		

(۳) چند روز اور مری جان

اجداد	باپ دادا	میراث	چھوڑا ہوا مال، جائیداد

محبوس	قید، گرفتار	گفتار	کہنا، مراد تقریر یا زبان کھولنا
تعزیر	قابل سزا جرم	قبا	لمبی قمیص
درد کے پیوند	دکھ درد میں اضافہ (مراد ہے)	عرصہ	لمبا وقت
دہر	زمانہ	گراں بار	بوجھل، وزنی
ستم	ظلم	آلام	الم کی جمع بمعنی دکھ تکلیف، رنج

(٤) مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ

درخشاں	چمکدار	ثبات	ہمیشگی، باقی رہنا
نگوں	جھک جانا	وصل	ہجر کی ضد، ملاقات
بہیمانہ	جانوروں سا	طلسم	جادو، افسوں
اطلس	قیمتی ملائم کپڑا مخمل	کمخاب	ایک قسم کا ریشمی کپڑا
کوچہ	گلی	لتھڑے	لپٹے ہوئے

10.11 سفارشی کتب :

۱۔	آج کا اردو ادب	ابواللئیث صدیقی
۲۔	نئے ادبی رجحانات	سید اعجاز حسین
۳۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
۴۔	"افکار" (فیض نمبر)	کراچی، 1965
۵۔	فن اور شخصیت (فیض نمبر)	صابر دت
٦۔	فیض احمد فیض	خلیق انجم

شیخ عطاء الرحمٰن، لیکچرر، گورنمنٹ کالج، سری رنگ پٹن

اکائی۔۱۱ : فیض احمد فیض کی نظمیں اور تشریح

(مجموعہ: "دست صبا" کی منتخب نظمیں)

ساخت :

11.0 اغراض ومقاصد

11.1 تمہید

11.2 فیض احمد فیض کے مجموعہ "دست صبا" کا تعارف

11.3 نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" متن

11.3.1 نظم کی تشریح

11.4 نظم ii۔صبح آزادی۔متن

11.4.1 نظم کی تشریح

11.5 نظم iii۔مرے ہم دم مرے دوست۔متن

11.5.1 نظم کی تشریح

11.6 نظم iv۔نثار میں تیری گلیوں کے۔متن

11.6.1 نظم کی تشریح

11.7 نظم v۔زنداں کی ایک شام۔متن

11.7.1 نظم کی تشریح

11.8 نظم vi۔زنداں کی ایک صبح۔ متن

11.8.1 نظم کی تشریح

11.9 عمومی جائزہ

11.10 خلاصہ

11.11 نمونہ امتحانی سوالات

11.12 فرہنگ

11.13 سفارشی کتب

11.0 اغراض و مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ دست صبا کی منتخب نظموں کے متن سے واقف ہو سکیں۔

☆ ان نظموں کی تشریح معلوم کر سکیں۔

☆ نظموں کا عمومی جائزہ کر سکیں۔

☆ شاعر کے خیالات اور انداز بیان سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

☆ اور ان نظموں کا معنی و مفہوم اپنے طور پر لکھنے اور بیان کرنے کے قابل بن سکیں۔

11.1 تمہید :

اس اکائی میں فیض کے مجموعہء کلام "دست صبا" سے چھے نظمیں لی گئی ہیں، پہلے ہر نظم کا متن دیا جائیگا، اور پھر اس کی تشریح پیش کی جائیگی، ہر ایک نظم کی تشریح کے مطالعہ کے بعد شاعر کے انداز فکر و نظر کی وضاحت بخوبی ہو جائیگی، ہر ایک نظم میں شاعر کے جن جذبات کو پیش کیا جائیگا، ان سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے فیض کے مختلف نظریات سے آگاہ ہو جائیں گے۔

11.2 فیضؔ کے مجموعہء "دست صبا" کا تعارف :

"دست صبا" فیض احمد فیضؔ کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے، جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا، یہ مجموعہء فیض کے ایام اسیری کی یادگار ہے جو اسی وقت شائع بھی ہوا تھا ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی سازش کیس کا واقعہ پیش آیا جس میں فیض پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں شریک ہیں انہیں اس سازش کے جرم کی پاداش میں سینٹرل جیل میں قید تنہائی کی سزا سنائی گئی، ان کے جیل میں قیام کے دوران ہی یہ مجموعہء شائع ہوا، اس مجموعہ میں فیض کا ابتدائیہ بھی شامل ہے، جو انہوں نے سنٹرل جیل حیدر آباد میں ۱۶ ستمبر ۱۹۵۲ء کو لکھا تھا۔

دست صبا میں فیض کی 21 نظمیں، 17 غزلیں اور 8 قطعات شامل ہیں، فیض کی یہ نظمیں ادبی اور فنی اعتبار سے بڑی اہم اور وقیع ہیں، اور کلاسیکی انداز میں فارسی تراکیب کی کثرت ان نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ ہندوستان کی تقسیم پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، اور برصغیر ہندو پاک میں ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی چونکہ فیض ترقی پسند شعراء کے صف اول کے شاعر تھے، ایک حساس دل اپنے سینے میں رکھتے تھے، اور عوامی درد کو اپنا درد سمجھتے تھے، اس لئے وطن اور اس سے دوستی اور خلوص دل سے وطن کی چاہت کا جذبہ ان کی رگ وریشہ میں سمویا ہوا تھا، اس لئے آزادیء وطن ہی اپنی بیشتر نظموں کا موضوع بنایا، اس طرح ان کا فن اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ صبح آزادی، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، مرے ہمدم مرے دوست، نثار میں تیری گلیوں کے، زنداں کی ایک شام، زنداں کی ایک صبح، سیاسی لیڈر کے نام وغیرہ جیسی خالص سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی نظمیں اس مجموعہ میں ملتی ہیں۔ کئی ایک ہنگامی واقعات کو بھی نظم کے پیرائے میں بڑی عمدگی سے باندھا ہے۔ ان نظموں میں ان کا انداز بیان نہایت شستہ اواسلوب شگفتہ اور طرز تکلم خاصا دل آویز دکھائی دیتا ہے، اثر آفرینی اور جدت طرازی کی ادا بھی ملتی ہے، غرض یہ کہ دست صبا کی نظمیں اپنے کلاسیکی انداز اور مضمون آفرینی کے ڈکشن کا ایک حسین مرقع ہیں، علامتوں کی زبان میں ڈھلے شعر، ایک نئی پہچان بنے، شیشہ وساغر، داغ داغ اجالا، عارضی محبوب کا شفاف بلور، روزن زنداں، صحن زنداں کے بے وطن اشجار، جیسے شعری اظہار دل آویز اور متاثر کن ہیں۔ فیض نے اس میں دیباچہ کی صورت میں ایک ابتدائیہ شامل کیا ہے جو انہوں نے سنٹرل جیل حیدرآباد میں 16، ستمبر 1952ء کو لکھا تھا اس ابتدائیہ میں فیض نے یہ کہا ہے کہ "شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے" اور حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضہ ہی نہیں فن کا تقاضہ بھی ہے، فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی کوشش وکاوش اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے، اور مجموعی طور پر اسکی عمدہ مثال یہ دست صبا ہے، بدوملت صبا ہے، جس سے فیض کی شاعری ایک نیا موڑ لیتی ہے۔

11.3 شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں : (متن)

موتی ہوکہ شیشہ، جام کہ درّ
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغر دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غم جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہادی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چو مکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گرجان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر !
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پر ہوسکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے ، یاور ہے یہاں
جو آنکھ اٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑکر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

11.3.1 شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں : تشریح

شاعر فیض احمد فیض کی یہ مشہور نظم ہے، اس میں شاعر نے دل کو کنایہ "شیشہ" کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں چاہے موتی ہو یا شیشہ، پیالہ ہو یا کہ گوہر جب ٹوٹ جاتا ہے تو پھر وہ ٹوٹا ہوا یا شکستہ ہی کہلاتا ہے اور پھر دوبارہ جڑ کر اپنی اصلی حالت میں نہیں آسکتا، وہ ایک بے وقعت اور بے حیثیت چیز بن جاتی ہے چاہے اس کے ٹوٹ جانے پر کوئی کتنے ہی آنسو کیوں نہ بہالے۔

جب کسی کو کوئی چیز عزیز ہوتی ہے اور وہ ٹوٹ جاتی ہے تو آدمی کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بڑے ہی جتن سے اس کے ریزے، یا ٹکڑے اٹھا کر اپنے سینے سے لگاتا ہے، اس لئے شاعر کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے یہ موتی یا پیالہ یا دل دوبارہ جڑ نہیں سکتا۔

یہ بات ضرورت ہے کہ ان شیشوں کے ریزے میں ایک ریزہ ایسا ضرور ہے جس سے ہمارے محبوب کی یاد جڑی ہوئی ہے، مگر دنیا والوں نے اس شیشہ کو توڑ دیا۔ اس ریزے سے شاعر کی جوانی کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ زمانے نے کہیں کا نہ رکھا، ایک طرف غربت بھوک اور غم روزگار ایسے حوادث تھے جن کا سامنا ایک شاعر نہ کرسکا جس کی وجہ سے اسکا دل چور چور ہو گیا۔

شاعر جوان ریزوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاید اس میں اس کی عزت نفس، مان مریادا ہے جو اسے بہت عزیز ہے، اس کی حفاظت ونگہداشت کے لئے شاعر نے اپنے سر پیر مارے تھے، یہ دنیا اس قدر سنگ دل ہے کہ کوئی غریب آدمی اپنی جان بچانا چاہتا ہے تو پھر کوئی نہ کوئی دن ایسا ضرور آتا ہے جبکہ اسے اپنی عزت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

پھر شاعر کہتا ہے ساغر، شیشہ، لعل و گہر، یہ ایسی چیزیں ہیں کہ دنیا میں ان کی قیمت اسی وقت مل سکتی ہے جبکہ یہ ثابت وسالم اور کسی بھی عیب سے پاک ہوں اگر یہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائیں تو صرف چبھتے رہتے ہیں، اور تکلیف دیتے ہیں ان شیشوں (دلوں) کا جوڑنے والا کوئی نہیں۔

یادگذشتہ دنوں کی یاد سے دل پر چھریاں چلنے لگتی ہیں ایک ایک واقعہ یاد آتا ہے تو آنسو نکل آتے ہیں، یہ وہ دنیا ہے جہاں شیشے بنتے ضرور ہیں مگر اس دنیا کی ریت بھی عجیب وغریب ہے یہاں جو بھی ہمت کرکے آگے بڑھتا ہے دنیا اس کی مٹھی میں آجاتی ہے، اور جو دھن دولت والا ہوجاتا ہے، اسکے کئی لوگ دشمن بن جاتے ہیں، اور اس سے اس کا مال چھین لے جانے کے لئے لاکھ جتن کرتے ہیں، اس طرح یہ سماج دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے، ایک آگ لگاتا ہے تو دوسرا طبقہ اسے بجھانے کی فکر کرتا ہے، ایک طبقہ دنیا بھر کی نعمتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے تو دوسرا اس سے سراسر محروم ہوجاتا ہے، اس لئے شاعر ان تمام مفلسوں بے بسوں اور بے کسوں کو جن کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں آواز دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اٹھو! یہ موقع ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کا نہیں بلکہ جنگ کرنے اور اپنا حق لینے کا ہے۔

11.4 نظم : (۲) صبح آزادی (اگست، ۴۷ء)

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
جوان لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی، لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قرین تھا، حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہوبھی چکا ہے فراق ظلمت ونور
سنا ہے ہوبھی چکا وصال منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

11.4.1 نظم : "صبح آزادی" کی تشریح :

فیض احمد فیض نے یہ نظم اپنے ملک کی جدوجہد آزادی کے پس منظر میں لکھی ہے،

ہر خار رہ دشت وطن کا ہے سوالی ﴿ کب دیکھئے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور

وہ ملک کی غلامی کو تاریکی سے اور آزادی کو اجالے سے تعبیر کرتے ہیں ایک لمبی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد جو آزادی نصیب ہوئی اور جو آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو کہتے ہیں اس اجالے میں جابجا داغ ہی داغ نظر آتے ہیں، جو صبح طلوع ہوئی ہے، اسے رات نے ڈس لیا ہے، کیا ہم نے اسی صبح کے لئے اتنے برسوں انتظار کیا تھا۔

شاعر سوال کرتے ہیں کیا ہم نے اسی صبح کے لئے اتنی ساری قربانیاں دی تھیں، نوجوانوں نے اس ملک کی آزادی کی خاطر اپنے آرام کو تج دیا تھا، ان کے لئے کئی چیزیں اس دنیا میں کشش رکھتی تھیں مگر ان سب کو چھوڑ کر یہ ملک کی آزادی کی خاطر اپنی ساری توانائیاں صرف کردی تھیں، اب یہ بات سننے میں آرہی ہے کہ اب غلامی اور آزادی دو الگ الگ چیزیں ہوگئی ہیں، اب ارباب وطن کے نزدیک اس آزادی کا مطلب لوٹ کھسوٹ اور چور بازاری ہے اور جن لوگوں نے اس کی آزادی کے لئے اپنا خون پسینہ بہایا تھا، ان کے لئے سوائے قید و بند کے اور کچھ صلہ وعطا نہیں ہے۔

ان نوجوانوں نے ملک کی آزادی کی خاطر جن راہوں کو چنا تھا، ان پر چلنے لگے تو نہ جانے کتنے ہی لوگوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی یہ وہ نوجوان تھے جن کے سامنے زندگی کے کئی ایک حسین سپنے اور زندگی کی بے شمار ضرورتیں اور دلکش راتیں تھیں، مگر انہوں نے ان سب کی قربانی دیتے ہوئے صرف ملک کی عظمت و بلندی کی برقراری اور اس کی آزادی کیلئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔

آج کل یہ بات سننے میں آرہی ہے کہ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے، اور ملک آزاد بن کر ایسے خونخوار اور ظالم حکمرانوں کے ہاتھ چلا آیا ہے جن کا انداز نظر اور طرز حکومت عوامی نمائندوں کی ضرورت اور مرضی کے سراسر خلاف ہے، یہاں وصل کی بات یا وصل کی خوشی حلال ہے اور ہجر کا عذاب حرام قرار دیا گیا ہے۔

ہزاروں لوگوں کے دل وجگر کی آگ ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی، اور کتنے افراد اس ملک کے ہجر کے عذاب میں مبتلا ہیں، ان کا کوئی خیال نہیں۔ صبح آزادی کی خاطر ان سب کی کوششیں ان کی نظر میں کوئی حیثیت یا اہمیت نہیں رکھتیں، باوجود اس کے ان تمام لوگوں کے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں ہے، ابھی بھی وہی جوش وحوصلہ اور جوان امنگیں ان کے دلوں میں کروٹ لے رہی ہیں، اس لئے شاعر کہتا ہے کہ چونکہ منزل ابھی نہیں آئی اس لئے اپنی منزل کو پانے کے لئے آگے ہی آگے بڑھنا ہوگا، اور منزل پر پہنچ کر ہی دم لینا ہوگا۔

اس نظم کا خاص وصف اسکا رمزیہ اور علامتی اسلوب ہے، فیض نے اس نظم میں علامتوں کی آئینہ خانہ سجادیا ہے، یہ نظم موضوعی، فنی اور ادبی اعتبار سے فیض کی اہم ترین نظم ہے۔ یہ نظم کلاسیکی انداز میں فارسی تراکیب اور ڈکشن کا حسین مرقع ہے، جہاں تک موضوع کا تعلق ہے، اس نظم میں 1947ء کی وجہ سے ملک کی جو تقسیم ہوئی تھی اس کی پر اثر انداز میں روداد بیان کی گئی ہے، ایک طویل داستان کو اپنی شعری تراکیب سے ایجاز واختصار کے پیرائے میں ڈھال دیا ہے۔

11.5 نظم ۳ : مرے ہمدم، مرے دوست (متن)

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائیگی
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہمدم، مرے دوست!

روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے بر فاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش

دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارض محبوب کا شفاف بلّور
یک بیک بادہء احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گل چیں کے لئے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت تیرے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جراح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

11.5.1 مرے ہمدم، مرے دوست (تشریح)

اس نظم میں انقلاب میں حسن اور حسن میں انقلاب کا پہلو کس قدر جاذب توجہ اور دامن کشِ قلب ونظر ہے اردو شاعری میں یہ ایک بالکل نیا تخیّل ہے اور فیض کی شاعری کا مضبوط ترین پہلو ہے، ملاحظہ کریں، فیضؔ کہتے ہیں اے میرے ہمدم اور اے میرے رفیق اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ میری دلجوئی اور پیار سے تیری ساری تھکن دور ہو سکتی ہے تو میں اس طرح تیری دلجوئی کروں، اور پیار دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر میں دلجوئی کرتے ہوئے یہ دیکھوں کہ تیری بدنامی اس سے دور ہو سکتی ہے تو میں اپنا پیار دینے کے لئے تیار ہوں، پیار کو باقی رکھنے کے لئے میں صبح شام تیرا دل بہلانے کے لئے آبشاروں بہاروں اور چمن زاروں کے گیت سناتا رہوں، ساتھ ہی میں صبح کے ستاروں کے سیاروں کے گیت اور حسن ومحبت کی حکایتیں سناؤں، اور یہ بھی بتاؤں کہ گرم ہاتھوں کی حرارت سے کئی حسیناؤں کے برف جیسے جسم پگھل جاتے ہیں، اور یہ بھی بتاتا چلوں کہ کیسے وہ لوگ جن سے ہم پوری طرح مانوس ہوتے ہیں، یکا یک حالات کے بدلتے وہ بھی بدل جاتے ہیں جیسے کسی صاف وشفاف بلّور میں پیالے میں شراب کے انڈیلے جانے سے سفید پیالہ سرخ پیالہ نظر آنے لگتا ہے، اور گلچیں کے آگے خود بخود گلاب کی شاخ جھک جاتی ہے، اور وہ گلاب کسی امیر کی خواب گاہ کو مہکانے لگتا ہے۔

مگر مجھے لگتا ہے کہ میرے گیت تیری دلجوئی نہیں کر سکتے، میرے گیت تیرے درد کا درماں نہیں بن سکتے میرے گیت تیرے ہمدم وغم خوار بھی نہیں بن سکتے، سوائے نشتر لگانے کے تیری بیماری کا کوئی اور علاج نہیں ہو سکتا۔

شاعر اپنے دوست سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میں تجھ سے دو چار باتیں تسلّی کی کرلوں اور اس سے تیرے دل ودماغ کو سکون میسر ہو اور تیری بیماری کی شفا اس میں ہے تو میں اسی سے تیرا دل بہلاتا رہوں اور ایسے گیت سناؤں جن میں آبشاروں کا بہاروں کا گیت سناؤں اور سناتا ہی رہوں اور تجھے یہ بتاؤں کہ آج سماج میں کیسے لوگ ایک دوسرے کے خریدار بن جاتے ہیں کس طرح یہاں ونا داریاں خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔ حسن وعشق کی بات بھی یہاں دولت کے ترازو میں تولی جاتی ہیں۔ اہل ثروت

کے دولت کدے کس طرح جواں جسموں کی خوشبوں سے بہک جاتے ہیں۔

تیری دلجوئی کی خاطر میں ایسے گیت سدا ہی گاتا رہوں مگر مجھے یقین ہے کہ میرے گیت تیرے دکھوں کا مداوا نہیں بن سکتے، میرے نغمے زخم کو چھیدنے والے نہیں تیرے ہمدرد اور مونس تو نہیں بن سکتے، لیکن میری مجبوری بھی تو دیکھ جو مصیبت تیرے سامنے ہے اس کے لئے نشتر ہی اس کا چارہ ہے۔

اس لئے اے مرے ہم دم، مرے دوست! مانا کہ دامن رفاقت چھوٹے اور نہ ہم پر ماحول کی اس جبریت میں ہم خود اپنے دکھوں کا آپ مداوا ہیں، خود زخم بھی اور خود ہی نشتر بھی۔

فیض کی نمائندہ نظم ہے، یہ نظم معنوی وفنی اعتبار سے رومان وحقیقت کے پیرائے میں بڑی عمدہ نظم ہے، استعاروں، کنایوں، اشاروں کا سہارا لے کر خوبصورت طریقے کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے، نہایت ہنرمندی نزاکت اور طرحداری سے شاعر نے نظم کے تار و پود ترتیب دیئے ہیں الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال میں فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے، جذبات واحساسات کی ترجمانی میں نفسیاتی انداز اختیار کی ہے، اور لطیف، نازک ترکیبیں استعمال کرتے ہوئے نظم کے مجموعی تاثر کو کہیں زیادہ گہرا دیرپا اور موثر بنا دیا ہے۔

11.6 نظم ٤ : نثار میں تیری گلیوں کے.....(متن)

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں، اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لئے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدّعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
اگر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

(از سنگ ہار ابستند وسگاں را کشادند، شیخ سعدی)

11.6.1 نثار میں تیری گلیوں کے... (تشریح)

فیض احمد فیض کی یہ نظم بھی جذبہء حب الوطنی میں ڈوبی ہوئی نظم ہے وطن اور ملک سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے وطن! میں تجھ پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوں مگر دکھ اس بات کا ہے کہ اس ملک میں اب ایسے قانون نافذ ہو گئے ہیں کہ یہاں آزادی نام کی کوئی چیز نہیں رہی اگر کوئی باشندہ شہر گھومنے کو نکلے تو پھر اسے نظریں بچا کر اور جسم و جاں کی حفاظت کرتا ہوا گذرنا پڑتا ہے، یعنی امن وامان نام کی چیز ہی باقی نہیں رہی۔ اس ملک کے جو پرستار ہیں ان کا معاملہ یہ ہے کہ لوگ آزادی سے چل پھر نہیں سکتے، ارباب حکومت ان پر کتوں کی طرح لپکتے ہیں، اگر ان کتوں کو مارنے کے لئے پتھر تلاش کئے جائیں تو پتھر زمین میں گڑے ہوئے اور کتے آزاد نظر آتے ہیں۔

جو بھی تیرے نام کی دہائی دیتا ہے اس پر یہ ارباب وطن طرح طرح سے ان پر جور و ظلم روا رکھتے ہیں اب تو ہی بتا کہ کس کے پاس انصاف کے لئے جائیں اور کہاں فریاد کریں، جب کہ مدعی بھی وہی منصف بھی وہی، ہمیں قید و بند کی صعوبتوں سے گذرنا پڑا اس کے بعد جو رہائی نصیب ہوئی تو ہم نے یہ سوچا کہ اب ہمارے ملک کی قسمت چمک گئی اور ہتھکڑیاں نہیں تو ہم نے سوچا کہ ملک کا اندھیرا ختم اور اب روشنی کا دور آنے والا ہے، مگر ایسا نہیں ہوا اب بھی ہمارے شام و سحر اسی تصور اور خیال میں گذرتے رہتے ہیں۔

غرضیکہ یہ دنیا کا دستور ہے کہ طاقتور کمزور پر ظلم کرتا ہے، نہ کمزور اپنے ارادوں سے باز آتے ہیں، اور نہ ہی طاقتور اپنے ظلم وستم سے ہم کمزوروں نے آگ میں پھول کھلائے ہیں زمانے سے کیا شکوہ شکایت کریں۔

اگر آج ہم تجھ سے دور ہیں تو کل ملن ہوگا، اور ضرور ہوگا ہماری یہ جدائی اور ہجر کی مدت طویل نہیں ہے، آج ارباب وطن طاقتور ہیں اور اپنی طاقت کے بل پر اپنے ظلم وستم کا نشانہ ہمیں بنا رہے ہیں، مگر یہ سلسلہ زیادہ طویل نہ ہوگا، ایک دن ضرور ایسا آئے گا جبکہ ہم اپنی منزل کا نشان پا ہی لیں گے، کیونکہ

جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

قید خانے میں ہلکی سی ایک امید یہ نظر آنے لگی کہ جیسے روزن زندان سے روشنی کا نزول بند ہوا تو میں یہ سمجھ بیٹھا کہ اب ظلم وستم کے دن ختم ہوئے ہماری تمنائیں بر آئیں گی اور ملک کو آزادی آخر کار نصیب ہو ہی جائیگی، جب ہمارے جسم پر موجود ہتھکڑیاں چمکنے لگیں تو بھی یہی گمان ہونے لگا کہ اب ظلم وستم کی حد ختم ہونے کو آئی ہے، اسی تصور اور خیال وفکر میں ہماری زندگی گذر رہی تھی، کہ مصیبتوں کی یہ گھڑیاں اب ٹلیں کہ آج اسی خیال میں ہمارے شب وروز گذر رہے تھے۔

سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حکمران طبقہ نے ہمیشہ ہی سے عوام کو محکوم بنائے رکھا اور اپنی حکمرانی کی بقاء کے لئے معصوم عوام کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانا ہی انہوں نے اپنا فریضہ سمجھا، اس لئے ارباب وطن کا یہ عمل نیا ہے اور نہ ہی ہمارا ظلم وستم سہنا نیا ہے، قدم قدم پر ان کو جیت نصیب ہوتی ہے ان کا ہر ارادہ کامیاب وکامران ہوتا ہے اور مظلوم عوام کو ہر پل ہار کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر ہمیں یہ امید ہے کہ کل کی آنے والی صبح ہمارے لئے خوشیاں لائے گی، ہماری جدائی لمبی نہیں ہوگی، آج ظالموں کی قسمت اچھی ہے کل ہماری قسمت اچھی ہوگی۔ یہ نظم ان کی بہترین اور نمائندہ نظموں میں سے ہے، لفظ ومعنی کا حسین سنگم ہے، اس نظم میں انکی شاعری کا جوہر پوری آب وتاب کے ساتھ چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

11.7 نظم : "زنداں کی ایک شام : (متن)"

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں محو ہیں بنانے میں
دامن آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موج درد فراق یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہوسکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

11.7.1 نظم "زنداں کی ایک شامہ : (تشریح)

فیض احمد فیض حیدر آباد جیل کے اپنے قید و بند کے زمانے کی ایک شام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زنداں میں شام ہو چلی ہے، اور دھیرے دھیرے رات آ رہی ہے، اور صبا پاس سے گذرتی ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پیار کی کوئی بات کہہ دی ہو قید خانے میں جتنے درخت ہیں وہ اپنا سر جھکائے ایسے کھڑے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے وہ آسمان پر نقش و نگار بنانے والے ہوں۔

رات ہوتی ہے اور چاندنی آہستہ آہستہ اترتی ہے، آسمان پر ستارے پھیل گئے ہیں اور آسمان پر ایک نور کی سی چادر پھیل گئی ہے، درختوں کی ڈالیوں کی اوٹ سے نیلگوں آسماں جھلکتا ہے، جسے دیکھ کر محبوب کی جدائی میں ہلکا درد دل میں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس زنداں کی اس شام میں بار بار یہی خیال آتا ہے کہ زندگی نہایت حسین اور شیرین ہے مگر لوگ اس حسین زندگی میں زہر گھولنے پر تلے ہوئے ہیں اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو ختم کر کے وہ اپنی منزل پالیں گے تو ایسا ممکن ہرگز نہیں ہے، ہم کو اگر ختم بھی کرتے ہیں تو ہماری مثال ایک شمع کی سی ہوگی جسے انہوں نے ختم کر دیا مگر ہم نے جو تحریک چلائی ہے اور اس کی روشنی سے لوگوں کے دلوں کو منور کیا ہے وہ چاند جیسا ہے اگر ان میں دم ہے تو وہ اس چاند کو ختم کر کے دکھائیں جو کسی طور ممکن نہیں ہے۔

وہ لائیں لشکر اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سر قتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے۔

قید خانے کی عمارت کے بالائی حصہ پر چاندنی کھلی ہوئی ہے، ستارے نہایت کم روشنی کے ساتھ ٹمٹمار ہے ہیں، آسمان نیلگوں ہو گیا ہے درختوں کی ہریالی بھی نیلگوں نظر آنے لگی ہے، جب یہ سارے مناظر دیکھتا ہوں تو محبوب و معشوق کی یاد آنے لگتی ہے جس کی وجہ سے دل میں درد کی ہلکی سی موج ابھر آتی ہے۔

اسی وقت دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ زندگی قدرت کا عطیہ ہے یہ مجسم شیریں ہے، مگر اس میٹھی اور خوش رنگ زندگی کو ظالموں نے اپنے زہر سے کڑوی اور کسیلی بنا ڈالی ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ حکمران اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے، ہماری ہمتیں بلند اور ہمارے ارادے چاند کی

سی عظمت و بلندی رکھتے ہیں وہ ہمیں تو اپنے منصوبوں سے روک سکتے ہیں، مگر کیا ان کی رسائی چاند تک ہوسکتی ہے، اور وہ چاند کی چاندنی ختم کر سکتے ہیں، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا تو ہماری ہمتیں بھی ختم ہونے والی یا ہم بھی تھک ہار کر بیٹھنے والے نہیں ہیں۔

یہ نظم زندان کی ایک شام یعنی انکی قید و بند کی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ رنج والم کا طوفان انکے دل میں تھا، اور اپنے ذاتی درد و کرب کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے اور اسے ایک خوبصورت نظم کی صورت عطا کی ہے۔

11.8 نظم : زنداں کی ایک صبح (متن)

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا۔ جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جوئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہ جام اتر آئی ہے
عکس جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر

جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحن زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطح ظلمت سے دمکتے ہوئے اُبھرے کم کم

نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھوڈالا تھا
دیس کا درد، فراق رخ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہل زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذت خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چوکڑ صدائیں جاگیں
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمن جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

11.8.1 نظم : زنداں کی ایک صبح (تشریح)

فیض کی یہ نظم بھی دوران قیدان پر بیتے لمحات کی ایک یاد ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک رات جب کہ ابھی اس کا ایک لمبا حصہ باقی تھا چاند آسمان سے اترا اور سرہانے کھڑا ہو کر کہنے لگا اٹھ کہ جس صبح کا تمہیں انتظار تھا وہ آچکی ہے، اور جس ملک کی آزادی کے خواب دیکھ رہا تھا وہ وقت قریب آچکا ہے۔

محبوب کے سے رخ والے چاند پر سے جب نظر ہٹی، رات کے ٹھہرے ہوئے پانی پر چاندی کے بھنور نظر آنے لگے، اور کنول کے پھول ڈوبتے تیرتے مرجھاتے اور کھلتے رہے۔ اس قید خانے کے ساتھی چہروں پر آزادی کی سنہری چمک لئے چہرے نیند کی مست وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

دور سے ایک چونکانے والی بگل بجنے کی آواز آتے ہی وہ قدم جو ایک سا کام کرتے ہوئے بیزار سے تھے، اپنے قدم جلد جلد اٹھاتے ہوئے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دینے لگے، ان کے چہرے زرد ہیں جو ان کی مفلسی وتنگدستی کو بتا رہے ہیں۔

رات بھر کی مست نیند کے مارے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا کہ لوگوں نے بعض دروازے بند ہو رہے ہیں تو بعض دروازوں کے بند کرنے کی آوازیں آرہی ہیں، چند قفل کھولے جا رہے ہیں تو چند ایک بند کئے جا رہے ہیں۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا تو ایک دریچہ سے بار بار کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگی، اور زنداں کی دیواریں جو لوہے اور پتھر کی بنی ہوئی ہیں جہاں دن اور رات کئی لوگ قیدی بن کر اپنی زندگی کے دن گن رہے ہیں اور یہ امید کر رہے ہیں کہ کوئی دن ضرور آئیگا جب کہ یہاں سے چھٹکارہ حاصل ہوگا۔

دور کہیں سے بگل کی آواز آئی جو کہ افسروں کو چونکائے رکھنے کے لئے تھی، کہ ظلم وستم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے تیار رہو۔ آواز کے آتے ہی سپاہیوں کے قدموں میں تیزی آنے لگی انہیں بھی روزانہ ایک جیسا کام کرتے کرتے بیزاری اور اکتاہٹ سی ہونے لگی تھی، ان کے چہرے وحشتناک اور ان کی ہر ادا ظلم وستم سے لبریز ہوا کرتی تھی۔

صبح ہوئی تو ہوائیں چلنے لگیں گویا صبح ہوئی تو ان کے ظلم وستم کی ایک نئی لہر چلی جس کے زیر اثر معصوم قیدیوں کی درد بھری آوازیں بھی گونجیں قید خانے کی کسی کوٹھری کا دروازہ کھلا تو کوئی بند ہوا کہیں کسی پر ہتھکڑی اور کس دی گئی اور کسی نے کسی کو خنجر ڈالا جس کی چیخ سنائی دی۔ تیز ہوا کے جھونکے سے دریچہ کا پٹ کھلنے اور بند ہونے لگا اس آواز نے دشمنوں کو نیند سے بیدار کر دیا، یہ سپاہی جن کے مضبوط اور تنومند جسم جنّات کی طرح لگتے تھے، معصوم قیدیوں کے رات دن ان نازک پریوں کی طرح ہیں جن پر یہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں تو ان اسیروں کے ترکش کے تیر اس امید پر ہیں کہ ہمارا ایک نہ ایک دن ان ظالموں پر وار ہوگا اور اس طرح اس ظلم کا سلسلہ کبھی ختم ضرور ہوگا، ویسے بھی۔

؎ بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

11.9 عمومی جائزہ :

فیض احمد فیضؔ کے مجموعہء کلام "دست صبا" کی یہاں چھ مختلف نظمیں دی گئی ہیں، یہ ساری نظمیں جذبہ حب الوطنی کی ترجمان ہیں۔ فیض اپنی نظم "شیشوں کا مسیحا" میں ایک حساس دل رکھنے والے شاعر کے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے اپنے دل کو شیشے سے تعبیر کرتے ہیں جو حالات کے ظلم وستم سے چور چور ہو گیا ہے، اور اب اس شیشہء کا کوئی مسیحا نہیں جو اسے جوڑ سکے۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہاں ڈگر ڈگر پر غربت بے روزگاری زمانے کے ظلم وستم کا سامنا ہوتا ہے جسے دیکھ کر ایک حساس شخص کا دل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، یہاں بڑے بڑے لوگ غریبوں کا خون چوس چوس کر مالدار بنے ہیں یہ غریبوں پر ہر طرح کے ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے ہیں، یہ ملک میں فساد مچاتے ہیں،

؎ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں؛ کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

انسان کا دکھ مایوسی کا درد کسی نہ کسی انسان کا ہی دیا ہوا ہوتا ہے،

دوسری نظم "صبح آزادی" میں شاعر اس صبح سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ یہ وہ صبح آزادی جس کی تمنا لے کر ہم چلے تھے کہ یہاں ہر کسی کو اپنا حق ملے گا، مگر جو صبح آئی وہ اپنے اندر داغ داغ اجالا

لے کر آئی ہے، مگر اب صبح دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے ہرگز ایسی صبح کی تمنا نہیں کی تھی جہاں ہمارے ارمانوں، ہماری آرزوؤں کا خون ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

تیسری نظم "مرے ہمدم مرے دوست" بھی شاعر کے ارمانوں اور حسین خوابوں کو بکھیرنے والے مناظر پیش کرتی ہے، یہاں محبت کے دام لگتے ہیں، دیکھتے دیکھتے وفاداریاں نیلام ہو جاتی ہیں، اس میں شاعر اپنے محبوب کے لئے اپنی ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار ہے۔

چوتھی نظم "نثار میں تیری گلیوں کے" بھی جذبہ حب الوطنی میں سرشار ہو کر کہی گئی ہے، یہ وہ وطن ہے جس کی آزادی کے لئے ہزار ہا قربانیاں دی گئی تھیں، ہزاروں تمنائیں اس وطن کی آزادی کی صبح سے وابستہ تھیں مگر جب یہ آزادی ملی تو ارباب وطن نے ان وطن پرستوں کے حوصلوں کو نشانہ ظلم بنائے ہوئے ان کو مقید کر ڈالا پھر اس نظم کے خاتمہ میں شاعر کہتا ہے کہ ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا یہ ازل سے چلا آرہا ہے، اس لئے ہم اب کسی کا گلہ نہیں کریں گے۔

پانچویں نظم "زنداں کی ایک شام" زنداں کی ایک شام کی کیفیت شاعر نے یوں بیان کی کہ شام ہو چلی ہے اور رات دھیرے دھیرے اتر رہی اور ٹھنڈی ہوا پاس سے گذری تو ایسے لگا جیسے کسی نے پیار کی بات کہہ دی ہو ستاروں کے نکلنے سے آسمان پر ایک نور کی چادر سی تن گئی ہے درختوں کے اوٹ سے نیلگوں آسمان جھلکتا ہے تو بے اختیار محبوب کی یاد آجاتی ہے، زندگی حسین ہے مگر لوگ اسے زہر سے بھر دیتے ہیں۔

چھٹی نظم: "زنداں کی ایک صبح" میں شاعر خوش امید ہے کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے، جبکہ ظلم وستم اور قید وبند کا سلسلہ ختم ہو جائیگا، چنانچہ ایک دن چاند میرے سرہانے آکر کہنے لگا کہ چلو اٹھ بھی جاؤ اب تک جو خواب دیکھا کرتے تھے، وہ خواب اب شرمندہ تعبیر ہونے کو ہیں، میں نے دیکھا کہ سامنے جو تالاب سا تھا اس کی چاندنی کے ہلکے سے نقوش چاندی کا بھنور بنا رہے ہیں، اور ایک حسین منظر پیش کر رہے ہیں۔

اس قید خانے میں میرے جو دوسرے ساتھی تھے ان کے چہرے قید خانے کی صعوبتوں کی وجہ

سے زرد ہو رہے تھے، وہ ہلکے سے نا امید نظر آ رہے تھے، ان کے دل مایوسیوں کے شکار ہو رہے تھے، ایسا لگتا تھا کہ انہیں اب ملک کی آزادی کی زیادہ امید باقی نہیں رہی۔

الغرض فیض کے مجموعہء کلام دست صبا کی ان چھ مختلف نظموں کے متن اور ان کی تشریحات سے یہ بات اُوپر بخوبی واضح ہوگئی ہوگی، کے فیض کے ملک اور ارباب ملک وطن کے بارے میں ان کے خیالات ارادے اور عزائم کیا تھے؟ ملک کو انہوں نے کس نظریہ سے دیکھا ارباب وطن کے ان کے ساتھ کیا معاملے ہوئے۔ قید خانے میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا اور کس طرح ان کے ارادوں کو کچلنے کی کوشش کی گئی، مگر باوجود اس کے شاعر امید ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ سلسلہ ختم ہوگا اور ایک ایسی صبح ضرور طلوع ہوگی جہاں ہر کس کو اس کے امیدوں کی صبح کا سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آئیگا۔ غرضیکہ یہ ساری نظمیں ادبی وفنی اعتبار سے اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔

11.10 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپ کو فیض کے مجموعہ دست صبا سے چھے (٦) مختلف عنوانات پر نظمیں اور ان کی تشریح سے واقف کروایا، اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔

آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف نظموں اور ان کی تشریح سے فیض احمد فیض کے نظریات وافکار کیا تھے، اس اکائی سے قبل کی اکائی میں آپ نے نقش فریادی کی نظمیں اور تشریح اور دیگر تفصیل پڑھی یہ اکائی بھی اسی قبیل کی ہے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ کی آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے۔ فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی، اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا، توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

11.11 نمونہ امتحانی سوالات :

۱۔ "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" نظم کا خلاصہ لکھئے؛

۲۔ "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" نظم کے استعارات وتشبیہات کی فہرست لکھئے:

۳۔ صبح آزادی میں شاعر نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ مفصل لکھئے:

۴۔ صبح آزادی کی فنی اور ادبی خوبیوں کا جائزہ لیجئے۔

۵۔ فیض کی نظم صبح آزادی کے پس منظر پر روشنی ڈالئے۔

۶۔ میرے ہم دم میرے دوست میں شاعر اپنے محبوب کو کن باتوں، کن گیتوں اور آبشاروں کے گیت سنانا چاہتا ہے، اور کیوں؟

۷۔ گیت اور نغمے درد کے درماں کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

۸۔ کسی ایک نظم کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالئے۔

"نثار میں تیری گلیوں کے"، یا "زندان کی ایک صبح"

11.12 فرہنگ :

لفظ	معنی	لفظ	معنی
(ا) شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں:			
جام	پیالہ	دُرّ	موتی، جمع دُرد (عربی لفظ)
اشک	آنسو	مسیحا	حضرت مسیح علیہ السلام یعنی حضرت عیسیٰؑ جن کے تعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بیماروں کو شفا بخشتے تھے۔
ساغر	پیالہ	صہبا	شراب
پری	ایک خیالی مخلوق	شہپر	چھت
بلوریں	کانچ	خلوت	تنہائی

چومکھ	چاروں طرف	عجز	عاجز آنا
شمشادقد	طویل قامت، بلند		
لعل وگہر	ہیرے موتی	سالم	مکمل، سارا
رفو	سینا	بخیہ	پیوند، ٹکڑا
کارگہ ہستی	دنیا	یاور	مالک، آقا
بختاور	نصیبہ والا	انت	انتہا، ختم
گھات	تاک میں رہنا	پربت	پہاڑ
ساگر	دریا، سمندر	نیلام	ہراج
اٹھائی گیرہ	بغیر اجازت کے جو ہاتھ لگے لے چلنے والا		
رن پڑنا	لڑائی ہونا، بھڑ جانا (محاورہ)		
نت	ہر	نگر نگر	شہر شہر
ماتھے	پیشانی	جوت	روشنی
بدجانا	ہارنا	رَن	میدان جنگ

(2) صبح آزادی

داغ داغ اجالا	آزادی کی صبح، داغدار یا اپنی امیدوں کے برخلاف طلوع ہونا
شب گزیدہ سحر	ایسی صبح جسے رات نے ڈس لیا ہو، غلامی کو رات کی سیاہی سے تعبیر کیا گیا ہو

فلک	آسمان	دشت	جنگل
سفینہء	کشتی	شاہ راہ	بڑی یا چوڑی سڑک
دیار	ملک	رخ سحر	صبح کا چہرہ
قرین	قریبی ساتھی	سبک	ہلکی
وصال	ہجر کی ضد (ملنا ملانا)	گام	قدم
نشاط وصل	ملاقات کی خوشی	عذاب ہجر	جدائی کا عذاب

(3) مرے ہمدم مرے دوست

تذلیل	ذلت، رسوائی	چمن زار	چمن جیسا
مہتاب	چاند	برفاب	برف کا پانی، ٹھنڈا پانی
مانوس	جس سے شناسائی ہو	نقوش	نقش کی جمع، علامت
طالع	قسمت، نصیبہ	استوار رکھنا	قائم رکھنا

(4) نثار میں تیری گلیوں کے۔۔۔۔

طواف	گھومنا، چہل قدمی کرنا	نظم بست وکشاد	مراد اختیار
سنگ وخشت	پتھر اور اینٹ	سگ	کتّا
بہانہ جو	بہانہ تلاش کرنے والا، حیلہ ساز	منصفی	انصاف
زنداں	قید خانہ	سلاسل	بیڑیاں ہتھکڑیاں واحد سلسلہ
خلق	مخلوق، لوگ، عوام	ریت	عادت، طور طریقہ
بہم ہونا	ملنا	اوج	بلندی
رقیب	دشمن	لیل	رات
نہار	دن	فلک	آسمان

(5) زندان کی ایک شام

پیچ وخم	راستہ کا ٹیڑھا پن	زینہ	سیڑھی
صبا	صبح میں چلنے والی ہوا	سرنگوں	سر جھکائے ہوئے
محو	مصروف	شانہ	کندھا
دست جمیل	خوبصورت ہاتھ	نیل	دریائے نیل ملک مصر کا
نیلگوں	نیلے رنگ والا	پیہم	بار بار مسلسل
کامراں	کامیاب ہونا	گل کرنا	بجھا دینا

(6) زنداں کی ایک صبح

سربالیں	سرہانے	اوس	شبنم

سطح ظلمت	اندھیرے کی سطح	نوبت	گھنٹی
زرد فاقہ	بہت بھوک کی وجہ سے چہروں کا زرد ہو جانا		
مخمور	شراب کے نشے میں چُور	جنات گراں	بھاری مشینیں
فریاد کناں	دہائی دینے والے		
اسیر	قیدی	ترکش	تیر رکھنے کا آلہ
یکلخت	اچانک، فوری	عارض	رخسار
شفاف	پاک وصاف	بادہء احمر	سرخ شراب
دہک جانا	سلگ اٹھنا	گلچیں	پھول چننے والا
ایوان	محل، کوٹھی	بننا	پرونا
مداوا	علاج، درماں	جرّاح	سرجن
مونس	دوست، غمخوار	نشتر	(انجکشن) زخم کو چیرنے کا آلہ
مرہم	دوا	آزار	تکلیف
چارہ	علاج	سفّاک	بے انتہا ظالم
ذی روح	جاندار	خروشاں	چیخ وپکار

11.13 سفارشی کتب :

ا۔نسخہء ہائے وفا	فیض احمد فیضؔ
۲۔شاعر	فیض نمبر
۳۔ادبی دنیا	رسالہ
۴۔ترقی پسند ادب	عزیز احمد
۵۔عکس اور جہتیں (فیض احمد فیضؔ)	شاہد ماہلی

شیخ عطاء الرحمٰن ، لیکچرر، گورنمنٹ کالج، سری رنگ پٹن

اکائی۔۱۲ : فیض احمد فیضؔ کی نظمیں اور تشریح

(مجموعہ: زنداں نامہ کی منتخب نظمیں)

ساخت:

12.0 اغراض ومقاصد

12.1 تمہید

12.2 فیض احمد فیضؔ کے مجموعہ: زنداں نامہ کا تعارف

12.3 نظم "ملاقات" متن

12.3.1 نظم کی تشریح

12.4 نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" متن

12.4.1 نظم کی تشریح

12.5 عمومی جائزہ

12.6 خلاصہ

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

12.8 فرہنگ

12.9 سفارشی کتب

12.0 اغراض و مقاصد:

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ فیض احمد فیضؔ کے مجموعہ کلام "زندان نامہ" کی منتخب دو نظموں کے مفہوم و معنی کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ فیض کی ان نظموں کے فنی محاسن سے واقف ہوں گے، ملک کی آزادی کی خاطر ایک حساس دل شاعر کے خیالات جذبات واحساسات سے واقف ہو سکیں گے۔

12.1 تمہید :

اس اکائی میں آپ فیض احمد فیضؔ کے مجموعہء کلام "زندان نامہ" سے لی گئی دو نظموں کی تشریح اور ان کے معنی وہ مفہوم سے واقف ہوں گے، جیسا کہ مجموعہ کلام کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ شاعر کی زندگی کے دور کشاکش سے تعلق رکھنے والے دنوں کی یادگار ہے۔ جس میں شاعر اور اس جیسے وطن پرست اور جیالے لوگوں کے درد وغم پوشیدہ ہیں اور ان نظموں کے مطالعے سے فیض کے مختلف نظریات سے آگاہ ہو جائیں گے۔

12.2 فیض احمد فیضؔ کے مجموعہء "زندان نامہ" کا تعارف :

فیضؔ کا یہ تیسرا مجموعہء کلام ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا، یہ دوران اسیری کی یادگار تخلیق ہے، زندان نامہ کی نظمیں یا پاکستان کے شہر منٹگمری جیل کی اسیری کے دوران لکھی گئی ہیں۔ یہاں شاعر غم جاناں اور غم دوراں کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، یہاں ہر قدم پر درد وغم کا سامنا تھا، اس درد وغم کو شاعر نے اپنے جذبات واحساسات کے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے، اس مجموعہ میں ۱۵ غزلیں، گیارہ نظمیں، اور سات قطعات اور نظمیں ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں میں ملاقات ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، درد آئے گا دبے پاؤں، روشنیوں کے شہر واسوخت وغیرہ ہیں۔

ان منظومات میں سے ہر ایک میں فیض نے نئے رنگ اور آہنگ کو کام میں لایا ہے۔ "اے روشنیوں کے شہر"، انہوں نے لاہور کے بارے میں لکھی ہے، اس میں انہوں نے فنکارانہ مہارت سے کام لے کر شہر کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی ایک ایسی تصویر ابھاری ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا"، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، خود فیض کی پسندیدہ نظموں میں ہے۔ ہر چند کہ یہ ایتھل اور روزن برگ جوڑے کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، لیکن ذرا غور سے پڑھئے بلکہ مکرّر پڑھئے تو اس کا کشادہ کینویس سامنے آئے گا۔ یہ نظم تو ان سارے

شہیدوں اوسرفروشوں کے نام ہے جو اپنے اپنے وطن کی آزادی کے لئے شہید ہوئے۔اس نظم میں رومانی عنصر بھی ہے لیکن انقلابی کیفیت پوری تابانی کے ساتھ ملتی ہے۔اس میں امیجری کے اہتمام میں بھی فیض نے کامیابی حاصل کی ہے۔یہی حال فیض کی دیگر نظموں کا ہے۔ونیز غزلوں کے اعتبار سے بھی زندان نامہ کی اہمیت ہے۔اوران غزلوں میں غمِ ذات اورغمِ جاناں کے ساتھ غمِ حیات اورغم دوراں کی کارفرمائی ملے گی۔وہ غزل جس کا مطلع ہے:

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب، جرمِ سخن سے پہلے

رومان اورانقلاب کا بھرپورامتزاج ہے،اس مجموعہ کی دیگرغزلوں کی بھی یہی کیفیت ہے!

زندان نامہ میں واسوخت کے عنوان سے "نظم" ہے اس کوغزل کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا، یہاں بھی انہوں نے واسوخت کوقومی وملکی کینوس میں ایک نیارنگ دے دیا ہے۔

ان منظومات میں فیض نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ شہر کے معاشرتی اورسیاسی حالات کی عکاسی کی ہے، یہاں فیض نے اپنے جذبات حسن وعشق، آپ بیتی وجگ بیتی کو نئے آہنگ میں پیش کیا ہے،ان کے کلام میں رومانی رنگ بھی ہے اورفلسفیانہ خیالات بھی ان کے یہاں فکروگفتار کا ایک بلنداورانفرادی انداز ملتا ہے،ان کے یہاں جذبات بھرپوراندازمیں پیش کئے گئے ہیں۔قیدو بند کی بندشوں نے ان کی شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی ہے۔مزدور کی حمایت اورسرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔اختصاراور جامعیت ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔فیض کی نظموں میں غم دوران اورغم جاناں دونوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔فیض عصری تقاضوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں،عوامی مزاج،غنائی لہجہ،نئے استعارےاورجدیدتشبیہات اور نادرتراکیب الفاظ کے نئے ڈکشن،ہجروووصال کا روایتی لب ولہجہ یہ ساری خصوصیات وافرمقدار میں فیض کے کلام میں جابجا پائی جاتی ہیں،ان کا کلام لفظ ومعنی کے اعتبار سے اپنے اندر کئی جہات رکھتا ہے۔یہی ساری خوبیاں فیض کی شاعری میں سلیقے کے ساتھ نبھائی گئی ہیں۔

2.3 نظم ۱۔ ملاقات (متن)

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نُور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر

شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقین بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

(مونٹگمری جیل، ۱۲۔اکتوبر تا ۳ نومبر ۵۳ء)

12.3.1 نظم "ملاقات" کی تشریح

فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام "زنداں نامہ" سے لی گئی ہے، یہ نظم ۱۹۵۳ء میں اپنی اسیری کے دوران منٹگمری جیل میں 12 اکتوبر تا 3 نومبر 1953 کو لکھی گئی، جیسے کے خود انہوں نے نظم کے آخر میں لکھا ہے۔ جیسا کہ مجموعہ کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ شاعر کی ملک کی خاطر جدوجہد اور اس کے زیر اثر شاعر کو قید و بند کی جن صعوبتوں کو جھیلنا پڑا، اسی کی بازگشت اس مجموعہ کی نظموں میں ہمیں ملے گی۔ "ملاقات" نظم میں شاعر نے ملک کی خاطر ہوئی جدوجہد اور اس سلسلہ میں تگ و دو کرنے

والے ہزاروں افراد سے متعلق ہلکے سے اشاروں کے ساتھ اس نظم کا آغاز کیا ہے، اپنے سیاسی وقومی پس منظر کے تحت اپنے موضوع الفاظ کے انتخاب مصرعوں کے دردبست امیجری اشاریت وتاثیر کی وجہ سے بہت خوب ہے۔ آپ جب بھی پڑھیں لطف اٹھائیں گے۔

شاعر کا خیال ہے کہ یہ رات جو اس ملک کو آزاد کرنے کی خاطر اٹھائی جانے والی مصیبتوں اور درد کی علامت ہے جو مجھ سے اور تجھ سے عظیم تر ہے، یہ اس ملک کی مثال ایک درخت کی ہزاروں شاخوں (کارکنوں) کی طرح ہے، جس میں سے ہر ایک اپنے ہاتھ میں مشعل لئے ہوئے غلامی کی تاریکی کو آزادی کی مشعل سے روشن کرنا چاہتا ہے ان جدوجہد کرنے والوں کو کبھی شاعر ستاروں سے تو کبھی مہتابوں سے خطاب کرتا ہے۔ اور پھر ان کی شہادتوں کو درخت کے پتوں پر گرنے والی شبنم کے قطروں کو موتیوں میں پروئے ہوئے ہار سے تشبیہ دے رہا ہے۔

ملک کو غلامی کے طوق میں گرفتار دیکھ کر جو درد اور غم ہمارے سینہ میں اٹھ رہا ہے، اگر اس میں ذرا سی اور تیزی آجائے تو یہی شرر بن کر اٹھے گا اور ظالموں کے لئے ایک تیر بن کر ان کے سینہ کے پار ہوگا۔ آخر ایک نہ ایک دن جیت ہماری ہوگی جب ہم اپنے ملک کو ان ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں سے چھین اسے آزاد کرلیں گے۔ ان ظالموں نے ہم پر ظلم وستم کے جتنے بھی وار کئے ہیں ان کے ہر تیر کو ہم نے اپنے سینہ پر سہہ لینے کا فیصلہ کرلیا ہے، ان کا ہر ظلم ہمارے لئے ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش ہے۔

اس ملک کی آزادی کی خاطر جن جن لوگوں نے قربانیاں دی ہیں اور ظالم ارباب وطن کے ظلم وستم سہے ہیں اور ان پر غلامی کی رات سوار ہے، وہ جہاں ہیں وہیں ان کے لئے صبح طلوع ہوگی ان کی ساری پریشانیاں دور ہوں گی اور ان کو ان کے خوابوں کی تعبیر ملے گی جس میں وہ اپنے خوابوں کا وطن دیکھیں گے، جہاں انسانوں کے درمیان کسی قسم کا فرق نہیں رہے گا، مزدور کو اس کی مزدوری ملے گی، حق داروں کو ان کا حق ملے گا اور ظالموں کے ظلم کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائیں گے۔

غرض نظم میں رات سحر کی شہادت دیتی ہے اور اس میں ملاقات درد کے رشتوں کی ایک علامت ہے، بلکہ ایک قوت بن کر ابھری ہے یہی نہیں اس نظم میں ظلم وستم کی رات اور شاعر پر اس کا ردِ

عمل ہے جانے یہ رات کب ختم ہو۔ وہ رات جس میں ہزاروں لاکھوں عوام اپنی زندگی کو خوبصورت بنانے کیلئے نا جانے کیا کر رہے ہیں، فیض نے اپنے محسوسات اور تجربات اور زبان کے استعمال میں اپنے رویہ اور اسلوب پر اپنی گرفت سے اس نظم کو ایک اہم نفیس اور نادر شہ پارہ بنا دیا ہے۔ اس نظم میں اگر ایک طرف فکر و فن مہارت و بصیرت اور تجربہ و انفرادیت کا عروج ہے، تو دوسری طرف اس میں رومان و بغاوت کے پاکیزہ عناصر بھی جلوہ گر ہیں، تشبیہات و استعارات اور علامات کا ایک کارواں ہے، جو اس نظم میں رواں دواں ہے، الفاظ کے انتخاب اور مصرعوں کی ترتیب میں شاعر نے غیر معمولی ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے، مصرعے ایک دوسرے میں پیوست اور ایک دوسرے سے پھوٹتے نظر آتے ہیں، فیض کی آواز اور ان کا لہجہ ہر مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے، معاشرتی و سیاسی تناظر اور فیض کے ذاتی حالات کی وجہ سے یہ نظم اور بھی خوب نکھر کر سامنے آتی ہے۔

12.4 نظم ۲ ۔ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے (متن)

(اتھیل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شام ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرف غزل، دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل، ۱۵ مئی ۵۴ء

12.4.1 "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" نظم کی تشریح

۱۹۵۴ء میں یہ نظم بھی منٹگمری جیل 15 مئی اسیری کے دوران کہی گئی تھی، جیسے کہ انہوں نے خود نظم کے آخر میں لکھا ہے۔

زنداں نامہ کی یہ ایک اہم نظم جو وطن کی محبت کے جذبے میں سرشار ہو کر لکھی گئی۔ یہاں وطن شاعر کے لئے ایک معشوق اور محبوب کی حیثیت رکھتا ہے، معشوق کی مناسبت سے شاعر یہ کہتا ہے کہ تیرے ہونٹ جو کہ پھولوں جیسے نازک ہیں ان کی چاہت میں دار و رسن کے مرحلے گذرنے پر بھی ہم کو کوئی افسوس نہیں ہوا۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ایک دن تیرے ہاتھوں میں آزادی کی شمع روشن ہوگی اسی امید پر ہم تاریک راہوں سے گذر گئے۔

دوسرے بند میں کہتے ہیں کہ اے معشوق تیرے ہونٹوں کی سرخی ہمارے جسم سے خون کے قطروں کی شکل میں ٹپکتی رہی، تیری زلفیں اس قدر دلکش تھیں اور تیرے ہاتھوں کی سفیدی چاندی کی طرح چمکتی تھی، اسی کی چاہت میں ہم نے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔

اے وطن جب ہم تجھے آزاد کرنے کے لئے آزادی کی راہ پر چلنے لگے تو اس راہ میں ہم جس قدر آگے بڑھ سکتے تھے بڑھ آئے ان راہوں میں آگے بڑھتے ہوئے تیری شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اسی وقت ہمارے دل میں ہلکے سے خدشے بھی اٹھ رہے تھے کہ کیا ہم اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب بھی ہوں گے۔ ہمارا یہ غم اس بات کا ثبوت تھا کہ اس روئے زمین پر تجھ سا حسین اور کوئی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی راہوں میں جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی مارے گئے۔

ہم اپنی منزل تک پہنچ نہیں پائے مگر تیری محبت میں اس قدر چور تھے کہ اس کو ہم نے اپنی تقدیر اور تدبیر سمجھ لی اور اس قدر آگے بڑھے کہ ہم نے اپنی جانوں کی قربانی دے دی اور اس قربانی پر کسی کو کسی سے کوئی شکوہ یا گلہ باقی نہ رہا۔

ہم نے وطن کی آزادی کی خاطر جو راہیں اپنائی تھیں، ان سے بہت سارے لوگوں کے حوصلوں کو جلا ملی ہماری قربانیوں کو انہوں نے اپنی زندگی کے لئے ایک آئیڈیل بنالیا، ہمارے قدموں کے نشان نے ان کے دکھ درد اور مصیبتوں کے طویل فاصلوں کو گھٹا دیا، اپنی جانوں کی قربانی دے کر ہم

ساری دنیا میں مشہور ہو گئے، اس طرح ہم نے دنیا والوں کے سامنے اپنی بھرپور محبت کا ثبوت فراہم کر دیا، ہم اگر تاریک راہوں میں مارے گئے تو کیا ہوا؟

؎ بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے ☆ فروغ گلشن و موت ہزار کا موسم (فیضؔ)

12.5 عمومی جائزہ :

فیضؔ کے مجموعہء کلام "زنداں نامہ" سے یہ دو نظمیں اس اکائی میں بیان کی گئی ہیں یہ دونوں نظمیں جذبہ حب الوطنی کو ظاہر کرتی ہیں، ہر نظم کے اندر جدید استعارے اور تشبیہات کی مدد سے اپنی وطن دوستی کو حسین و دلفریب پیرائے میں شاعر نے بیان کیا ہے، اسی راہ میں جتنے درد و الم نصیب ہوئے ان کو شاعر نے محض وطن سے محبت کی خاطر خوشی سے اپنے دل میں بسا لئے، وہ اپنے طور سے ہر قربانی پیش کرتے ہوئے اس ملک کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے، اس ملک میں جو سماجی نابرابری دکھائی دے رہی ہے اسے ختم کرنا چاہتا ہے، ملک کو ظالم حکمرانوں کے پنجوں سے چھڑا کر ایک آزاد ملک بنانا چاہتا ہے تا کہ لوگ آزاد فضا میں آزادی کی سانس لے سکیں۔

ہمارے ملک کے لئے جو چاہت ہے وہ ایک دن تیر بن کر ظالم حکمرانوں کے سینوں کے پار اترے گا، اس طرح ہم اپنے مقصد میں کامران و کامیاب ہو سکیں گے۔

دوسری نظم یہاں بھی شاعر نے اپنے وطن کو اپنے محبوب سے مستعار لیا ہے، اور محبوب سے متعلق چیزوں سے جس طرح اپنے جذبات و احساسات کو شعراء نے پیش کیا ہے اسی انداز کو شاعر نے برتا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم دار و رسن کی مصیبتیں جھیل لیں اس امید پر کہ ایک دن آزادی کی شمع روشن ہوئی مگر ہم جس تاریکی کی راہ چل رہے تھے، اسی میں ہماری جانیں چلی گئیں۔ ملک کی آزادی کی جدو جہد کے دوران ہماری طاقتیں ظالم حکمرانوں کی سازشوں اور فتنوں کے مقابلے میں نہایت کمزور تھیں اسی لئے بار بار ہمارے دلوں میں یہ خدشات ابھر رہے تھے، کہ کیا ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب ہو بھی سکیں گے مگر ہمارا جام شہادت پینا اوروں کے لئے حوصلہ مندی پیدا کر گیا تو ہمارا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ ہاں وہ دن ضرور آنے والا، ہے

جب یہ وطن غلامی کی ہتھکڑیاں ایک دن اتار پھینکے گا اور آزادی کی صبح ضرور طلوع ہوگی، جہاں اندھیرا ختم ہوگا اور وہیں روشنی شروع ہوگی، اور چاروں طرف پھیلے گی۔

12.6 خلاصہ :

اس اکائی میں ہم نے آپ کو فیضؔ کے مجموعہ "زندان نامہ" سے دو مختلف عنوانات پر نظمیں اور ان کی تشریح سے واقف کروایا۔ اغراض و مقاصد اور تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں، آپ کے علم میں آچکا ہے کہ ان مختلف نظموں اور ان کی تشریح سے فیض احمد فیضؔ کے نظریات اور افکار کیا تھے، اس کے علاوہ اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ کی، آخر میں نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے گئے، فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی اور سفارشی کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، توقع ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

12.7 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ فیض نے اپنی نظم "ملاقات" میں اپنے کن جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے؟ مفصل لکھئے۔

۲۔ نظم "ملاقات" میں کن تشبیہات واستعارات سے کام لیا گیا ہے؟

۳۔ فیض کی نظم ملاقات کی ادبی وفنی خوبیوں پر روشنی ڈالئے۔

۴۔ نظم ملاقات پر اپنے تاثرات قلمبند کیجئے۔

۵۔ ملک کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

۶۔ ملک کی خاطر قربان ہونے والوں کی کیا نشانیاں بتائی گئی ہیں؟

۷۔ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، نظم کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالئے۔

۸۔ ملک کی خاطر قربان ہونے والے اور ظالم حکمرانوں کے بارے میں شاعر کے کیا خیالات ہیں، اپنے الفاظ میں لکھئے

12.8 فرہنگ : نظم "ملاقات"

لفظ	معنی	لفظ	معنی
شجر	درخت	مشعل بکف	ہاتھ میں مشعل لئے
گلنار	گہرے سرخ رنگ والا پھول جو انار کے پھول کی طرح ہوتا ہے		
سیہ	سیاہ۔کالا	نورگر	روشن، روشنی والا
موج زر	سونے کی چمک رکھنے والی لہر، سنہری موج		
تپ	سلگنا		
جگرفگار	جن کے جگر زخمی ہوں، افلاک		آسمان (فلک کی جمع)
شرار (شر کی جمع)	چنگاری، شعلہ	گلزار	چمن
آتشیں ہار	آگ کے ہار		

نظم : ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے :

دار	سولی	نارسائی	اپنی مراد کو نہ پہنچنا
علَم	جھنڈا، پرچم	الم	غم، دکھ
خشک	سوکھی	دمکتی	چمکتی چمک، روشن
قندیل	چراغ		

12.5 سفارشی کتب

۱۔ افکار فیض نمبر

۲۔ شاعر فیض نمبر

۳۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ احتشام حسین

۴۔ آج کا اردو ادب ابواللیث صدیقی

۵۔ فیض احمد فیض خلیق انجم

۶۔ فن اور شخصیت فیض نمبر، صابر دت

شیخ عطاء الرحمٰن: لیکچرر،
گورنمنٹ کالج، سری رنگ پٹن

Karnataka State Open University

Manasagangotri Mysore - 570 006

The Open University system has been initiated in order to augment opportunities for higher education and as an instrument of democratizing education.

National Education Policy 1986

REGIONAL CENTRES

Bangalore
Davanagere
Gulbarga
Dharwad
Shimoga
Mangalore
Tumkur
Hassan
Chamarajanagar
Bellary
Mandya
Kolar
Bijapur
Belagaum
Ramanagar
Bangalore (another one)
Chikmagalur
Udupi
Karwar
Bidar
Mysore

HEAD QUARTERS

Total Study Centres : 123

Regional Centres : 21

B.Ed Study Centres : 10

M.Ed Study Centres : 06

KSOU

Higher Education to everyone everywhere

ಉನ್ನತ ಶಿಕ್ಷಣ ಎಲ್ಲರಿಗೂ ಎಲ್ಲೆಡೆ

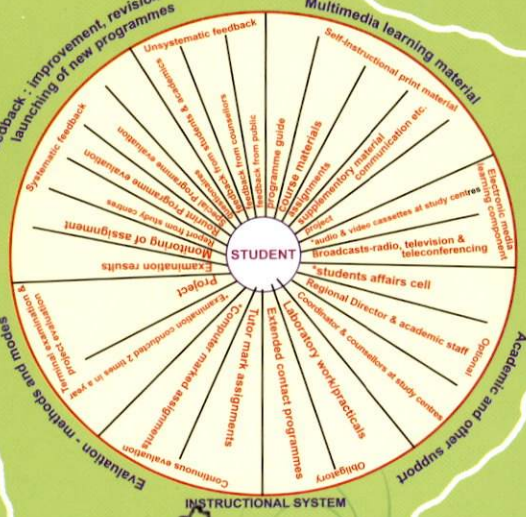

ಕರ್ನಾಟಕ ರಾಜ್ಯ ಮುಕ್ತ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾನಿಲಯ

ಮಾನಸಗಂಗೋತ್ರಿ, ಮೈಸೂರು – 570 006

Karnataka State Open University

Manasagangotri, Mysore - 570 006 Website : www.ksoumysore.edu.in